July 1998 • No. 260 • Rs. 8

دباؤ کے تحت ہر آدمی جھک جاتا ہے۔
قابلِ تعریف انسان وہ ہے جو دباؤ کے
بغیر جھک جائے۔
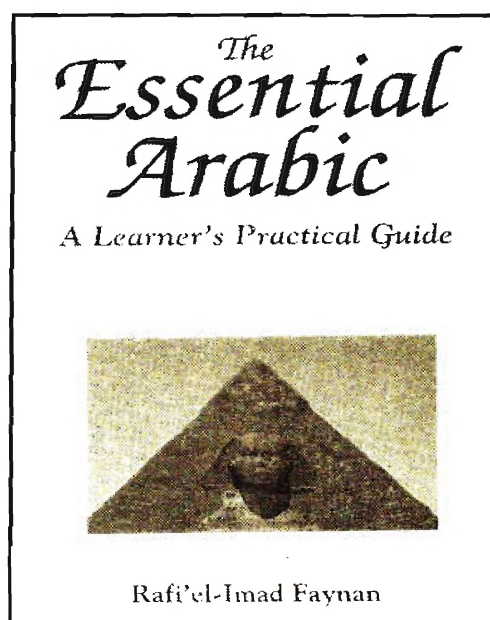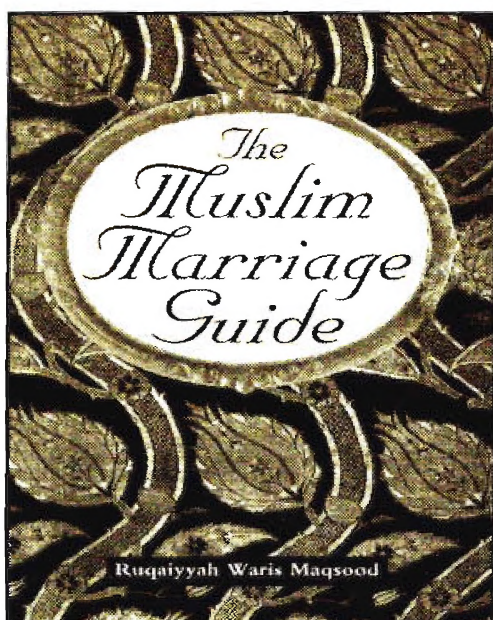
Muslim Marriage Guide

By Ruqaiyyah Waris Maqsood

Islam teaches that marriage is 'half of religion'. Because it fulfils so many basic needs of individuals and of society, it is the cornerstone upon which the whole Muslim life is built.

Modern life brings strains and pressures which can upset even the most compatible relationship. This means that nowadays, to protect the spirit of cooperation and happiness which is the sign of the true Islamic marriage, careful thought needs to be given to the mechanisms which help husband and wife to live together and respect each other's rights.

This highly-readable book takes the reader through the relevant passages in the Quran and Hadith, and goes on to discuss the main social and emotional problems that can afflict relationships, suggesting many practical ways in which these can be resolved.

ISBN 81-85063-25-7 Pages 192, Price Rs. 250

The Essential Arabic

A Learner's Practical Guide

By Rafi'el-Imad Faynan

This practical guide to modern Arabic is presented in a very simple and easy-to-grasp style. Unique in its approach, it explains the language by analyzing sample sentences in the kind of crystal clear manner which leaves a lasting impression on the reader's mind. The step-by-step approach of this easy-to-use guide will be found useful not only for beginners, but also for more advanced students. It can also be a handy tool for teachers of the language. One is finally left wondering how the hitherto dreaded learning of Arabic could have been made so delightfully simple...

ISBN 81-85063-26-5 Pages 184, Price Rs. 200

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, Near DVB Office,
New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 4697333, 4647980
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in
website: http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 8
One year Rs. 90. Two years Rs. 170.
Three years Rs. 250. Five years Rs. 400
Abroad: One year $ 20/£10 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577

DISTRIBUTED IN USA BY
MAKTABA AL-RISALA
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel. 718-2583435

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

جولائی ۱۹۹۸، شمارہ ۲۶۰

فہرست

صفحہ

النبأ العظیم

قرآن کی سورۃ نمبر ۷۸ اس طرح شروع ہوتی ہے: لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ رہے ہیں، اس بڑی خبر کے بارے میں، جس میں لوگ مختلف ہیں۔ ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے۔ ہرگز نہیں۔ عنقریب وہ جان لیں گے (النبا: ۱-۵)

اس آیت میں النبأ العظیم یا بڑی خبر (great news) سے مراد قیامت کی خبر ہے۔ یعنی وہ وقت جب کہ صور پھونک دیا جائے گا اور قیامت کا عظیم دن لوگوں کے اوپر پھٹ پڑے گا۔ آج لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہر آدمی مختلف انداز میں اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ لیکن جب قیامت کی بڑی خبر واقعہ بنے گی تو ہر قسم کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ تمام لوگ ایک ہی بات سوچیں گے، تمام لوگ ایک ہی بات بول رہے ہوں گے۔ ایک بڑی خبر تمام چھوٹی خبروں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اس معاملہ کا ایک چھوٹا سا نمونہ مئی ۱۹۹۸ میں سامنے آیا۔ ۱۱ مئی اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ کو انڈیا کی حکومت نے راجستھان میں پانچ زیر زمین ایٹمی دھماکے کئے۔ یہ دھماکے ہیروشیما اور ناگاساکی (۱۹۴۵) میں گرائے جانے والے ایٹم بموں سے بہت زیادہ طاقتور تھے۔ یہ واقعہ پیش آتے ہی سارے ملک کے لئے سب سے بڑی خبر بن گیا۔ عالمی میڈیا جس میں اس سے پہلے انڈیا کا ذکر بہت کم ہوتا تھا اس میں اب انڈیا ہی سب سے بڑی خبر کے طور پر چھا گیا۔ چند دن کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک بڑی خبر نے تمام چھوٹی خبروں کو نگل لیا ہو۔

یہ واقعہ گویا قیامت کی ایک اطلاع ہے۔ آج ہر آدمی اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ ہر زبان پر الگ الگ باتوں کا چرچا ہے۔ کوئی آدمی نہ چپ ہونے کے لئے تیار ہے اور نہ دوسرے کی بات ماننے کے لئے آمادہ۔ لیکن جب قیامت کی بڑی خبر کا اعلان ہوگا تو اچانک ساری صورت حال بدل جائے گی۔ لوگ دوسری تمام باتوں کو بھول کر ایک ہی بڑی بات کے بارے میں سوچیں گے، وہ یہ کہ قیامت کی ہولناکی سے کس طرح اپنے آپ کو بچائیں۔ ایک بڑی خبر تمام چھوٹی خبروں پر چھا جاتی ہے، ایک بڑی خبر تمام چھوٹی خبروں کو مٹا دیتی ہے۔ یہ بات دنیا کے بارے میں بھی درست ہے اور آخرت کے بارے میں بھی مزید اضافہ کے ساتھ درست۔

قیادت کا معیار

قرآن (المائدہ ۳) میں بتایا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم لوگ انسانوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو (فلا تخشوهم واخشون) قرآن کی یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اس دنیا میں مسلمانوں کے لئے اصل مسئلہ خشیت انسانی کا نہیں ہے بلکہ خشیت خداوندی کا ہے۔ بظاہر اگر انسانوں کی طرف سے کوئی خطرہ آتا ہوا دکھائی دے تب بھی انہیں خدا ہی کی طرف دوڑنا چاہئے۔ کیونکہ تمام معاملات کا سرا خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی ان کا فیصلہ کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف کرنے والا ہے۔

قرآن کے اس بیان سے قیادت کا معیار معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ معیار ہے جو یہ طے کرتا ہے کہ کون سی قیادت اسلامی قیادت ہے اور کون سی قیادت جاہلی قیادت۔ جو قائد لوگوں کو اللہ سے ڈرائے، جو ففروا الی الله انی لکم منه نذیر مبین (الذاریات ۵۰) کی زبان میں کلام کرے، وہ اسلامی قائد ہے۔ یہی وہ قائد ہے جس کی سرگرمیاں دین اور اہل دین کے لئے خیر کا باعث ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس دوسرا قائد وہ ہے جو لوگوں کو انسانی خطروں سے ڈرائے۔ جس کی تحریروں اور تقریروں کا خلاصہ یہ ہو کہ وہ انسانی سازشوں کا انکشاف کرکے لوگوں کو ان کے خلاف لڑنے کے لئے ابھارتا ہو۔ اس قسم کی قیادت بلاشبہ جاہلی قیادت ہے۔ اس سے دین اور اہل دین کے لئے کوئی خیر برآمد ہونے والا نہیں۔

ایسے جاہلی قائدین کے مقابلہ میں اہل اسلام کا رویہ وہ ہونا چاہئے جو قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے ----- جن سے کہنے والوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے خلاف اسباب اکٹھا کر لئے ہیں ان سے ڈرو۔ لیکن اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے (آل عمران ۱۷۳)۔

جاہلی قائدین ایک فتنہ ہیں۔ اس لئے وہ کبھی دنیا سے ختم نہ ہوں گے۔ کامیاب وہ ہے جو ان کی جاہلی باتوں کے فریب میں نہ آئے اور خشیت الٰہی کی بنیاد پر اپنے فکر و عمل کی تعمیر کرے۔

وحدتِ انسانیت

۵ اپریل ۱۹۹۸ کو میں رشی کیش میں تھا۔ اس وقت یہاں ایک پروگرام کے تحت مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر ایک مجلس میں چند تعلیم یافتہ ہندوؤں سے ایک مفید گفتگو ہوئی۔ اس کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ انسانی سماج میں باہمی رواداری (ٹالرنس) اور احترام (رسپکٹ) کا ماحول کس طرح پیدا کیا جائے۔ انھوں نے اس کا حل یہ بتایا کہ لوگوں کے اندر وحدت حقیقت (oneness of reality) کا عقیدہ بٹھایا جائے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ سچائی ایک ہے مگر اس کے راستے مختلف ہیں۔ آدمی جس مذہبی طریقہ پر بھی چلے، آخر کار وہ خدا تک پہنچ جائے گا۔

یہ ایک قدیم نظریہ ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے جو دلیلیں دی جاتی ہیں سب کی سب تمثیل پر مبنی ہیں۔ مثلاً مذکورہ مجلس میں ایک ہندو اسکالر نے کہا کہ اگر آپ ایک پہاڑی کے نیچے کھڑے ہوں تو وہاں آپ کو ایک ہی راستہ دکھائی دے گا جو پہاڑی کے اوپر جا رہا ہوگا۔ لیکن اگر آپ پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جائیں اور اس کے چاروں طرف دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ پہاڑ کے ہر طرف راستے ہیں اور وہ سب الگ الگ ہونے کے باوجود ایک ہی بلندی پر پہنچ رہے ہیں۔

اس قسم کی تمثیل علمی اعتبار سے کوئی وزن نہیں رکھتی اس کو نہایت آسانی کے ساتھ دوسری تمثیل سے رد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بمبئی یا دہلی جیسے ریلوے اسٹیشن پر کوئی شخص کھڑا ہو تو اس کو سیکڑوں گاڑیاں چلتی ہوئی نظر آئیں گی مگر یہ سمجھنا یقینی طور پر درست نہ ہوگا کہ ان میں سے ہر گاڑی ایک ہی آخری اسٹیشن کی طرف جا رہی ہے۔ مذکورہ تمثیل میں تمام راستے اگر ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں تو اس قسم کی دوسری تمثیل میں ہر راستہ الگ الگ منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی سماج میں احترام اور رواداری کا ماحول پیدا کرنے کے مسئلہ سے مذکورہ نظریہ کا کوئی تعلق نہیں حتیٰ کہ اگر تمام لوگ اس عقیدہ کو مان لیں تب بھی وہ مطلوب سماجی مقصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ایک مذہب کو ماننے والے گروہ کے درمیان باہمی طور پر ہر زمانہ میں لڑائیاں جاری رہی ہیں اور آج بھی جاری ہیں۔ پھر جو نظریۂ اتحاد ایک مذہب کے

درمیان کارآمد نہ ہوسکا، وہ مختلف مذاہب کے درمیان کس طرح کارآمد بن جائے گا۔

"وحدتِ دین سماجی اتحاد پیدا کرتا ہے"—— یہ نظریہ بظاہر یہ فرض کرتا ہے کہ 'وحدت دین' کے اصول کو ابھی تک عمل میں نہیں لایا گیا ہے، اب اس کا عملی تجربہ کرنا ہے۔ حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نہایت اعلیٰ سطح پر اس نظریہ کا تجربہ کیا گیا مگر وہ سراسر ناکام ثابت ہوا۔ شہنشاہ اکبر کی حکومتی طاقت، ڈاکٹر بھگوان داس کا انسائیکلوپیڈیائی علم اور مہاتما گاندھی کی مقبول لیڈرشپ، اس قسم کے بہت سے نام ہیں جو اس ناکام تجربہ میں نمایاں طور پر شامل ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج ہمارے سامنے جو اصل مسئلہ ہے وہ وحدت دین کے نظریہ کے تجربہ کا نہیں ہے بلکہ اس کے لمبے تجربہ کے باوجود مطلوب نتیجہ نہ نکلنے کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جو چیز مفقود ہے وہ نظریہ کی موجودگی نہیں ہے بلکہ نظریہ کے موجود ہوتے ہوئے نتیجہ کا حاصل نہ ہونا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں اس نظریہ کے سوا ایک اور حل تلاش کرنا ہے نہ کہ اسی ناکام تجربہ کو مزید دہرانا۔

اس معاملہ میں زیادہ صحیح اور قابل عمل نقطۂ نظر وہ ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ اس معاملہ میں قرآن نے جو تصور دیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان نفس واحدہ سے پیدا کیے گئے ہیں (النساء-۱) یعنی تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ تمام انسان ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں۔ اس لحاظ سے تمام انسان آپس میں بہن بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب کے سب آپس میں بلڈ سسٹرز اور بلڈ برادرز ہیں۔

اس تصور کے مطابق، سماج میں اتحاد و احترام کا ماحول پیدا کرنے کی بنیاد وحدت انسانیت ہے۔ یعنی یہ کہ تمام لوگ اس حقیقت کو مانیں کہ ظاہری اختلاف کے باوجود سب کے سب اصل ایک انسانی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے اعتبارات سے بظاہر مختلف ہونے کے باوجود وہ انسانی اعتبار سے ایک ہیں۔

سماج میں اتحاد و احترام کی فضا پیدا کرنے کے لیے یہی واحد فارمولا ہے جو قابلِ عمل ہے اور اسی کے ساتھ فطرت کے مطابق بھی۔

نکاح کا معاملہ

عام طور پر مشہور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی (نکاح میری سنت سے ہے، پس جو شخص میری سنت سے انحراف کرے تو وہ مجھ سے نہیں) یہ پورا جملہ اس صورت میں حدیث نہیں ہے۔ ابن ماجہ (کتاب النکاح) کی روایت کے مطابق، حدیث کے اصل الفاظ صرف یہ ہیں: النکاح من سنتی۔

البتہ ایک اور روایت میں بقیہ الفاظ آئے ہیں۔ ایک تفصیلی روایت میں آیا ہے کہ تین صحابیؓ نے آپ کی عبادات کے بارے میں حضرت عائشہ سے پوچھا۔ حضرت عائشہ نے آپ کی عبادات کے بارے میں جو بتایا وہ انہیں کم دکھائی دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ کے برابر نہیں اس لئے ہمیں زیادہ عمل کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ کے لئے ازدواجی زندگی کو ترک کردوں گا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔ لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے ازدواجی تعلق بھی قائم کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔ (فتح الباری ۹/۶)

جیسا کہ متن سے واضح ہے، حدیث میں فمن رغب عن سنتي کا تعلق تمام شرعی اعمال سے ہے نہ کہ مخصوص طور پر نکاح سے۔ دوسری بات یہ کہ اس حدیث کا تعلق سادہ طور پر صرف نکاح نہ کرنے سے نہیں ہے۔ بلکہ اعتقادی طور پر نکاح کو قابل ترک سمجھنے سے ہے۔ (فتح الباری ۹/۸)

اصل یہ ہے کہ نکاح کی حیثیت نماز کی طرح کسی لازمی فریضہ کی نہیں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جو شخص نکاح نہ کرے وہ تارک صلاۃ لی طرح گنہگار ہو جائے۔ یا اس کا ایمان مکمل نہ ہو۔ اس معاملہ میں اصل مطلوب چیز باعفت زندگی ہے نہ کہ ہر حال میں اور لازمی طور پر نکاح کرنا۔ کوئی گروہ اگر اجتماعی طور پر نکاح کا طریقہ چھوڑ دے تو یہ یقیناً درست نہ ہوگا کیوں کہ ایسی صورت میں بقاء نسل خطرہ میں پڑ جائے گی۔ لیکن اگر

انفرادی طور پر کوئی شخص اپنے حالات کے اعتبار سے نکاح نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو ایسا کرنا اس کے لئے عین جائز ہو گا، بشر طیکہ وہ اپنی عفت کو محفوظ رکھے۔

تاریخ میں بہت سی ایسی دینی شخصیتیں پائی جاتی ہیں جنہوں نے نکاح نہیں کیا اور پوری زندگی غیر ازدواجی حالت میں گذار دی۔ پیغمبروں میں حضرت عیسےٰ علیہ السلام اس کی ایک مثال ہیں۔ امت محمدی میں بھی کئی ایسے ممتاز بزرگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے ساری عمر نکاح نہیں کیا، مثال کے طور پر امام نووی (وفات ٦٧٦) اور امام ابن تیمیہ (وفات ٧٢٨)۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں سید جمال الدین افغانی، وغیرہ۔ اگر نکاح مطلق طور پر مطلوب ہوتا اور نکاح سے اعراض دین سے اعراض کے ہم معنی ہوتا تو ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ مذکورہ قسم کی شخصیتیں نکاح کے بغیر زندگی گذاریں اور اسی حال میں دنیا سے چلی جائیں۔

فقہ کی زبان میں، نکاح حسن لذاتہ نہیں ہے بلکہ حسن لغیرہ ہے۔ یعنی وہ بذات خود مطلوب نہیں ہے بلکہ ایک اور ضرورت کے تحت مطلوب ہے اور وہ بقاء نسل ہے۔ چونکہ مرد اور عورت کے درمیان ازدواجی تعلق کے بغیر نسل انسانی کا باقی رہنا ممکن نہیں اس لئے نکاح کی حیثیت ایک اجتماعی فریضہ کی ہے۔ لیکن وہ ہر فرد پر لازم نہیں۔ کوئی فرد اگر اپنے ذاتی مصالح کی بنا پر غیر ازدواجی زندگی گذارنے کا فیصلہ کرے تو ایسا کرنا اس کے لئے عین جائز ہو گا۔ ایسی حالت میں شریعت اس سے پاکدامنی کا تقاضا کرے گی نہ کہ جبری ازدواج کا۔

نکاح کی دینی اہمیت اصلاً اس اعتبار سے ہے کہ وہ بقاء نسل کے مقصد کو حاصل کرنے کا جائز طریقہ ہے۔ مرد اور عورت اگر نکاح کے بغیر باہم ملیں تو اس کے ذریعہ سے بھی نسل انسانی کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے۔ مگر یہ طریقہ اسلام میں قطعی طور پر حرام ہے۔ اسلام میں بقاء نسل مطلوب ہے مگر یہ بقاء نسل نکاح کی صورت میں ہونا چاہئے نہ کہ اس کے بغیر۔

بعض افراد ایسے ہو سکتے ہیں جو یہ محسوس کریں کہ اگر وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے اپنے کو آزاد رکھیں تو وہ عفیف بھی رہیں گے اور اسی کے ساتھ اعلیٰ انسانی مقاصد کے لئے زیادہ خدمات انجام دے سکیں گے۔ ان افراد کے لئے ایسا کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مخصوص حالات میں باعث ثواب بھی ہے۔

حکمت حیات

مشین، مثلاً گھڑی کے اندر دندانہ دار پہیہ (cog wheel) ہوتا ہے۔ایک پہیہ کے چلنے سے دوسرا پہیہ چلتا ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک پہیہ ساتھ نہ دے تو نہ کاگ وہیل چلے گا اور نہ مشین حرکت میں آئے گی۔

یہی معاملہ موجودہ دنیا میں انسانی منصوبوں کا بھی ہے۔ یہاں بھی دو کاگ ہیں اور زندگی کے نظام کا چلنا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ دونوں کاگ ایک دوسرے سے مل کر چل رہے ہوں۔

اس دنیا میں ایک پہیہ انسان کا ہے اور دوسرا پہیہ خارجی حالات کا۔ یہاں آدمی اتنا ہی کر سکتا ہے جتنا کہ خارجی حالات اس کے لئے ہم آہنگ ہوں۔ایسی حالت میں آدمی کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ یہ جانے کہ حالات کے اعتبار سے وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں۔

یہاں ممکن کے دائرہ میں عمل کرنے والا مثبت نتیجہ حاصل کرے گا۔ اور جو شخص ناممکن کے دائرہ میں دوڑے اس کے حصہ میں آخر کار تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ یہ اصول فرد کے لئے بھی درست ہے اور قوم کے لئے بھی درست۔

کسی شخص سے آپ کی نزاع ہو جائے تو ایسی حالت میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہوتا کہ انصاف کے مطابق کیا ہونا چاہئے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقی صورت حال کے مطابق، عملی طور پر کیا ہو سکتا ہے۔اس لئے اس قسم کے مواقع پر آپ کو چاہئے کہ آپ ممکن پر راضی ہو جائیں نہ کہ نظری انصاف کو لے کر بے فائدہ طور پر لڑتے رہیں جس کا نتیجہ مزید نقصان کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ یہاں بھی قومی لیڈروں کو یہ دیکھنا چاہئے کہ حقیقی حالات کے اعتبار سے کیا چیز قابل حصول ہے اور کیا چیز قابل حصول نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اس کی ایک سبق آموز مثال یہ ہے کہ امریکہ سو سال سے بلا انقطاع ترقی کرتے کرتے دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور ملک بن گیا۔ دوسری طرف اسی دنیا میں روس کسی مستحکم ترقی سے محروم رہا۔اسی طرح ہندستان اور پاکستان بڑے بڑے قیادتی ہنگاموں کے

باوجود کوئی حقیقی ترقی حاصل نہ کر سکے۔

میں نے تقریباً ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔ میں نے اس معاملہ کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک اس کا سبب وہی کاگ وہیل کا قانون ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔

امریکہ کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو اپنی جدید تاریخ کی ابتدا ہی سے ایسے لیڈر مل گئے جو نظریہ سازی کے فریب سے آزاد تھے۔ انہوں نے فطرت کے قوانین کو سمجھا اور اس کی مطابقت کرتے ہوئے اپنا قومی سفر طے کرنا شروع کیا۔

فطرت کا یہ اصول ایک لفظ میں صحت مند مقابلہ (healthy competition) ہے۔ انہوں نے ملک میں ہر ایک کو آزادی دے دی اور ہر ایک کے لئے یہ موقع کھول دیا کہ وہ مقابلہ و مسابقت کے میدان میں اپنی اہلیت کا ثبوت دے کر اپنی مطلوب ترقی حاصل کر سکے۔ انہوں نے حکومت کو لا اینڈ آرڈر (نظم و نسق) کے دائرہ تک محدود رکھا اور تمام لوگوں کو عمل کی کھلی آزادی دے دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں کے استعمال کا بے روک ٹوک موقع مل گیا۔

ایک لفظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ امریکہ کے رہنماؤں نے کسی خود ساختہ نظریہ کو اصل قرار دے کر اس کے تحت اپنے سماج کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ صرف یہ دیکھا کہ فطری طور پر کیا چیز قابل بقا (sustainable) ہے، اور جو چیز فطری طور پر قابل بقا تھی اس کو اختیار کر لیا۔

اس کے برعکس روس (سوویت یونین) میں یہ ہوا کہ کچھ نظریہ سازوں نے اپنے خود ساختہ تخیلات کو اصل قرار دے کر اس کے مطابق پورے سماج کو ڈھالنے کی کوشش کی اور جب سماج کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو کروروں لوگوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مار ڈالا۔ یہ اسکیم فطرت کے خلاف تھی، اس لئے ۷۰ سالہ پر شور کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

یہی معاملہ ہندستان اور پاکستان میں پیش آیا۔ یہاں بھی کچھ رہنماؤں نے اپنے خود ساختہ نظریات کو اصل قرار دے دیا اور یہ چاہنے لگے کہ پورے ملک کو اسی ذاتی نظریہ کے تحت ڈھال دیں۔ یہ زبردستی کا نفاذِ نظام بھی مکمل طور پر ناکام رہا۔ اور پچاس سال کی قیمتی مدت نہایت بیدردی کے ساتھ ضائع ہو گئی۔

ہندستان اور پاکستان کے رہنماؤں کو بھی یہی کرنا تھا کہ وہ اس اصول کو اختیار کرتے جس کو فطرت پانی کے معاملہ میں اختیار کرتی ہے۔ پانی جب پہاڑ کی چوٹی سے بہنا شروع ہوتا ہے تو فطرت اس کو خود اپنے کورس پر بہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ قدرتی نشیب و فراز سے گزرتا ہوا سمندر تک پہنچ جاتا ہے۔

ہندستان اور پاکستان کے رہنماؤں کو بھی یہی کرنا تھا۔ وہ حقیقی حالات کو سمجھتے اور سماج کو فطرت کی شاہراہ پر آزادانہ چلنے دیتے۔ اس طرح اپنے آپ صحت مند مسابقت کا ماحول بنتا اور ہر ایک کی صلاحیتیں ظاہر ہو کر ترقیاتی عمل میں اپنا حصہ ادا کرتیں۔ مگر نظریاتی جنون نے زبردستی کی منطق پیدا کی اور زبردستی کی منطق نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

موجودہ دنیا میں کام کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زندگی کو فطرت کی شاہراہ پر آزادانہ چلنے دیا جائے اور اگر کسی کے ذہن میں اپنا کوئی علٰحدہ نقشہ ہے تو اس کو وہ ترغیب (persuasion) کے دائرہ میں محدود رکھتے ہوئے پر امن طور پر اس کی اشاعت کرے اور اس وقت کا انتظار کرے جب کہ لوگوں کی سوچ بدل جائے اور خود فطرت ہی کے قانون کے مطابق اس کا عملی قیام ممکن ہو جائے۔

سماجی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ کسی رہنما کے دماغ میں اس کا نظریاتی نقشہ کیا ہے۔ بلکہ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ عملی حالات کے لحاظ سے کیا چیز قابل حصول ہے۔ سماجی نظام کی تشکیل میں رہنما کا حصہ صرف پچاس فی صد ہے۔ بقیہ پچاس فی صد خارجی حالات کا ہے۔ رہنما اگر اس حقیقت کو نہ سمجھے اور اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ پورا ملک صد فی صد اس کے اپنے نام الاٹ ہو چکا ہے تو یہ دیوانگی کی حد تک ایک مہلک غلط فہمی ہوگی۔ اس غلط فہمی کے تحت وہ جو بھی کام کرے گا اس کا نتیجہ صرف تخریب ہوگا نہ کہ تعمیر۔

آئیڈیلسٹ بننا اچھا ہے۔ مگر عملی حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں آئیڈیل کا حصول ممکن نہیں۔ اجتماعی زندگی میں کسی کامیابی کا راز یہ ہے کہ آدمی فکری اعتبار سے آئیڈیلسٹ ہونے کے باوجود عملی اعتبار سے پریکٹیکل بن جائے۔

ایمان کا کرشمہ

ابن تیمیہ مشہور حنبلی عالم ہیں وہ شام میں ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں وفات پائی۔ ان کی قبر دمشق میں ہے۔ ان کی کتابوں کی تعداد تین سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔

اپنے غیر مقلدانہ خیالات کی وجہ سے وہ اکثر حکومت اور علماء کے عتاب کا شکار ہوئے۔ ان کو جلاوطنی اور قید کا سامنا کرنا پڑا ان کی وفات بھی دمشق کے قید خانہ میں ہوئی۔

انھوں نے اپنے بارے میں ایک بار کہا کہ: جنتی فی صدری إن رحت فھی معی لا تفارقنی إن حبسی خلوۃ وقتلی شھادۃ و اخراجی من بلدی سیاحۃ۔ یعنی میری جنت میرے سینے میں ہے جب میں چلتا ہوں تو وہ میرے ساتھ ہوتی ہے وہ کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوتی۔ میری قید میرے لیے تنہائی ہے اور جلاوطنی میرے لیے سیاحت ہے۔ اگر کوئی مجھے قتل کر دے تو وہ بھی میرے لیے شہادت ہوگی۔

ایمان ایک فکری انقلاب ہے۔ وہ آدمی کے طرز فکر کو پوری طرح بدل دیتا ہے۔ اس تبدیلی کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنے آپ میں جینے لگتا ہے۔ حق کی دریافت اس کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ دنیا کا کھونا اور دنیا کا پانا اس کے لیے ایک اضافی چیز بن جائے۔ ایسے آدمی کے لیے قید ایک ایسی تنہائی ہوتی ہے جہاں وہ زیادہ غور و فکر کا موقع پا لے اگر اس کو اپنے وطن سے باہر نکلنا پڑے تو وہ اس کے لیے مطالعہ اور مشاھدہ میں توسیع کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اگر اس کو جان و مال کے نقصان سے دوچار ہونا پڑے تو وہ بھی اس کی روحانیت میں اضافہ کا سبب بن جاتا ہے۔

ایمان آدمی کی روحانیت کو جگاتا ہے، وہ اس کے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ایک صاحب ایمان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ مادی سہاروں سے اوپر اٹھ جائے، وہ ایک بلند تر ربانی سطح میں سانس لینے لگے ایسے آدمی کے لیے کوئی محرومی محرومی نہیں کیونکہ جو اعلیٰ حقیقت اس نے پائی ہے وہ اس وقت بھی بھرپور طور پر اس کو حاصل رہتی ہے۔ جب کہ بظاہر تمام دنیوی چیزیں اس سے چھن چکی ہوں وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو خدائی جنت میں پاتا ہے جب کہ انسانوں نے اپنی بنائی ہوئی جنت سے اس کو باہر نکال دیا ہو۔

ایمان ایک طاقت ہے، بلکہ تمام طاقتوں سے زیادہ بڑی طاقت۔

سیکھنے کا مزاج

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق ؓ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے (کان یتعلّم من کل احد) اس معاملہ کی ایک مثال روایات میں اس طرح آئی ہے کہ ایک بار انھوں نے ایک صحابی سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے امیر المومنین کیا آپ کبھی ایسے راستہ سے گزرے ہیں جس کے دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں۔ حضرت عمر ؓ نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں نے اپنے دامن سمیٹ لیے اور بچتا ہوا نکل گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہی تقویٰ ہے (ذلك التقوىٰ)

حضرت عمر کا یہی طریقہ عام معاملات میں بھی تھا۔ وہ اونٹ والوں سے اونٹ کی بات پوچھتے تھے اور بکری والوں سے بکری کی بات۔ اسی طرح ان کو جو شخص بھی ملتا اس سے اسی کے میدان کی بات دریافت کرتے۔ اس طرح وہ ہر ایک سے اس کے معلومات کے دائرہ میں سوالات کرتے اور اس سے نئی نئی باتیں دریافت کرتے۔

موجودہ زمانہ میں اسی کو اسپرٹ آف انکوائری کہا جاتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے اس کی بے حد اہمیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ زیادہ بڑے عالم بنتے ہیں جن کے اندر یہ متجسسانہ اسپرٹ موجود ہو۔ اس قسم کی اسپرٹ ہر ایک کے لیے انتہائی ضروری ہے، خواہ وہ ایک عام آدمی ہو یا کوئی اونچے سطح کا آدمی۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سننے سے زیادہ سنانے کے شوقین ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کا مزاج علم کی ترقی میں ایک مستقل رکاوٹ ہے ایسے لوگ کبھی زیادہ بڑی علمی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ جب آپ بولتے ہیں تو آپ وہیں رہتے ہیں جہاں کہ آپ ہیں۔ مگر جب آپ سنتے ہیں تو آپ اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ صحیح علمی مزاج یہ ہے کہ آدمی بولنے سے زیادہ سنے، وہ جب بھی کسی سے ملے تو سوالات کر کے اس سے معلومات لینے کی کوشش کرے۔

معلومات کا خزانہ ہر طرف اور ہر جگہ موجود ہے۔ مگر وہ صرف اس شخص کے حصہ میں آتا ہے جو اس کو لینے کے آداب کو جانتا ہو۔

فطرت کے خلاف

شری گرو گولوالکر آر ایس ایس کے دماغ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے یکساں سول کوڈ کے تصور کی مکمل مخالفت کی ہے۔ ان کی یہ مخالفت مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ فطرت کی بنیاد پر ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر فطری اسکیم ہے۔ انھوں نے کہا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے :

Nature abhors uniformity

اس بات کا تعلق صرف یکساں سول کوڈ سے نہیں ہے بلکہ پوری زندگی سے ہے۔ زندگی کا نظام پورا کا پورا فطرت کے اصولوں پر قائم ہے۔ یہ فطری اصول خود اپنے زور پر قائم ہیں اور وہ ابد تک قائم رہیں گے۔ کسی بھی شخص یا حکومت کے لیے صرف یہ موقع ہے کہ وہ فطرت سے موافقت کرے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے لڑ نہیں سکتا۔ فطرت سے لڑنا ایسا ہی ہے جیسے بھونچال سے لڑنا، اور کون ہے جو بھونچال سے لڑ کر کامیابی کی امید کر سکے۔

تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو اقتدار مل گیا تو اس نے سمجھا کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ اس بھرم کے تحت انھوں نے بڑے بڑے اقدامات شروع کر دیے۔ انھوں نے چاہا کہ زندگی کے مروجہ نقشہ کو توڑ کر خود اپنی پسند کے مطابق اس کا ایک نقشہ بنائیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہر طاقت کے حصہ میں صرف ناکامی آئی۔ فطرت کا نظام جس طرح پہلے قائم تھا اسی طرح وہ بعد کو بھی قائم رہا۔

چنگیز خان سے لے کر نادر خان تک، اور ہٹلر سے لے کر اسٹالن تک، اور پھر موجودہ زمانہ کے آمروں اور ڈکٹیٹروں تک ہر ایک اسی کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں پوری تاریخ انسانی میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔

انھیں فطری اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اس دنیا میں امن کے لیے بقا ہے جنگ کے لیے بقا نہیں۔ یہاں عدل کو جماؤ ملتا ہے ظلم کو نہیں۔ یہاں تواضع کو جگہ ملتی ہے گھمنڈ کو نہیں۔ یہ دنیا فراخدلی کو قبول کرتی ہے تنگ نظری کو نہیں۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس قانون سے کسی کا ٹکرانا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ پتھر کی چٹان سے اپنا سر ٹکرانے لگے۔

اظہارِ حق

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے : پس تم جمے رہو جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے اور حد سے نہ بڑھو بے شک وہ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا، ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں، پھر تم کہیں مدد نہ پاؤ گے (ھود ۱۱۲-۱۱۳) نیز (بنی اسرائیل ۷۳-۷۴-۷۵)

سچا داعی اپنے مدعو کا آخری حد تک خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ حرص کی حد تک یہ چاہتا ہے کہ لوگ دین حق کو اختیار کرلیں ایک طرف داعی کا یہ جذبہ ہے اور دوسری طرف وہ یہ دیکھتا ہے کہ دعوت کو جب کھلے طور پر بیان کیا جائے تو لوگ اس سے بھڑکتے ہیں قریب ہونے کے بجائے وہ اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ داعی جب تنہا ایک خدا کی بڑائی بیان کرتا ہے تو یہ چیز ان لوگوں کو ناگوار ہوتی ہے جو خدا کے سوا کچھ اور لوگوں کی بڑائی اپنے سینے میں لیے ہوئے ہوں وہ جب برائی کی مذمت کرتا ہے تو اس کا یہ اسلوب ان لوگوں کو سخت ناگوار ہوتا ہے جو ان برائیوں میں ملوث ہوں۔

یہ صورت حال دیکھ کر داعی کبھی یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اپنے اسلوب میں کچھ اعتدال پیدا کرے وہ حق کی دعوت کو ایسے انداز میں بیان کرے جو لوگوں کو اس کے قریب لانے والا ہو۔ مگر اس قسم کا مصالحانہ انداز اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اللہ کے نزدیک اصل اہمیت اعلان حق کی ہے نہ کہ رعایتِ عوام کی۔ داعی اگر اپنے اسلوب دعوت میں اس قسم کا مصالحانہ انداز اختیار کرے تو اس کا یہ فائدہ تو ہو سکتا ہے کہ اس کی شخصی مقبولیت میں اضافہ ہو جائے۔ مگر یہ فائدہ اس نقصان کی قیمت پر ہوگا کہ حق غیر واضح ہو کر رہ جائے۔ اور اللہ کی نظر میں اصل اہمیت وضاحتِ حق کی ہے نہ کہ مقبولیت عوام کی۔

اگر مدعو پر یہی بات واضح نہ ہو کہ حق واقعۃً کیا ہے تو دعوتی عمل کا سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں۔

دو نمونے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس شخص کے سامنے بھی اسلام کو پیش کیا اس نے اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ تردد کا اظہار کیا۔ مگر ابوبکر کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کے سامنے جب میں نے اسلام کی دعوت پیش کی تو انھوں نے کسی شبہ یا تردد کا اظہار نہیں کیا بلکہ فوراً ہی اسلام قبول کر لیا (حیاۃ الصحابہ ۱/۶۸) حضرت ابوبکر اپنی اسی صفت کی بنا پر الصدیق کہے گئے۔

اسلام کے دور اول کی تاریخ میں ایک نمونہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہے۔ دوسرا نمونہ وہ ہے جو حضرت عمر فاروق کی زندگی میں ملتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت عمر نے پہلے اسلام کی سخت مخالفت کی اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ انھوں نے قرآن کے کچھ حصہ کو پڑھا اور اس پر غور کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے رویہ کو بدلنے کا فیصلہ کیا اور شرح صدر کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔

یہ دو علامتی نمونے ہیں۔ یہ دونوں رہنما نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حق کے معاملہ میں انسان کو ان دو میں سے کسی ایک کی مانند ہونا چاہیے۔ ان دو کے بعد کوئی تیسرا نمونہ مطلوب نمونہ نہیں۔

پہلے نمونہ کے مطابق، آدمی کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ گہرے غور و فکر کے ذریعہ اپنے ذہن کو اتنا پختہ بنائے کہ وہ خود ہی حقیقت کو اس کی گہرائی تک سمجھ جائے۔ وہ فکری اعتبار سے خود یہ اہلیت رکھتا ہو کہ شکوک و شبہات کے پردے کو پھاڑ سکے اور غیر متعلق بحثوں میں الجھے بغیر چیزوں کو ان کی اصل صورت میں دیکھ لے۔ یہ فکری پختگی کا اعلیٰ درجہ ہے اور حضرت ابوبکر صدیق اسی درجہ کی آخری تکمیلی مثال ہیں۔

دوسرے نمونہ کے مطابق، آدمی کو متعصبانہ فکر اور بے اعترافی سے آخری حد تک پاک ہونا چاہیے۔ اس کو نفسیاتی پیچیدگیوں سے اتنا زیادہ خالی ہونا چاہیے کہ جب بھی دلیل کی زبان میں اس کی کسی کوتاہی کی نشاندہی کی جائے تو وہ فی الفور اس سے باخبر ہو جائے اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ حضرت عمر فاروق اس دوسرے نمونہ کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ نے ایک ایسا فیصلہ فرمایا جو درست نہ تھا اس کے بعد کسی شخص نے دلیل کی زبان میں اس کی وضاحت کی تو آپ نے فوراً ہی اس کو مان لیا اور شدت اعتراف کے تحت آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے:

لولا فلان لهلك عمر۔

اسلام تغیر پزیر دنیا میں

اسلام کا ظہور چودہ سو سال پہلے ہوا۔ پھر آج کی دنیا میں وہ کس طرح قابل عمل ہو سکتا ہے ؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ پھر اسلام جیسا ایک غیر متغیر دین بعد کے زمانہ کے لوگوں کو کس طرح رہنمائی دے سکتا ہے۔ ایک نہ بدلتی ہوئی حقیقت بدلتے ہوئے حالات سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔

یہ سوال تمام تر مفروضات پر قائم ہے۔ اس کے پیچھے غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسلام نہ کلی معنوں میں غیر متغیر حقیقت ہے اور نہ زمانہ کلی معنوں میں متغیر حقیقت۔ اصل یہ ہے کہ اسلام فطرت کا ایک قانون ہے۔ اسلام کا ایک حصہ وہ ہے جو اسی طرح ابدی ہے جس طرح فطری حقیقتیں ابدی ہوتی ہیں۔ اسلام کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں بدلتے ہوئے حالات کی رعایت پہلے ہی سے موجود ہے۔

خود زمانہ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ زمانی حالات کی نوعیت بھی یہی ہے کہ اس میں کچھ چیزیں ابدی طور پر یکساں رہتی ہیں۔ مثلاً سورج سے روشنی لینا اور ہوا سے آکسیجن حاصل کرنا۔ ان کے علاوہ کچھ چیزیں وہ ہیں جو ظاہری طور پر، نہ کہ حقیقی طور پر، بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً سواری یا طرز تعمیر وغیرہ۔ ان دوسرے قسم کے معاملات میں اسلام نے پیشگی طور پر ایسی رعایتیں اور گنجائشیں رکھ دی ہیں جو ہر بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہوں اور اس طرح اسلام ہمیشہ اپنی قابل عمل ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھے۔ یہاں اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ إن هذا الدين يسر (البخاری، کتاب الإیمان) یعنی دین آسان ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دین میں سب آسانی اور سہولت والے احکام ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دین کا نظام ایسے فطری انداز میں بنایا گیا ہے کہ وہ ہر صورت حال میں قابل عمل رہے۔ اہل اسلام کا سفر حیات کبھی بھی کسی ایسے مرحلہ سے دوچار نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو بند گلی (impasse) میں محسوس کرنے لگیں۔

یہاں اس سلسلہ میں اسلام کے چند اصول درج کئے جاتے ہیں جن سے یہ بات بخوبی طور پر واضح ہوتی ہے کہ حالات کی کوئی بھی تبدیلی اسلام کے لئے مسئلہ نہیں۔ ہر صورت حال میں اسلام اپنی فعالیت کو یکساں

طور پر باقی رکھتا ہے۔

۱۔ اسلام کے کچھ احکام وہ ہیں جو بنیادی احکام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اسی طرح ابدی ہیں جس طرح فطرت کے قوانین ابدی ہیں۔ اسلام کے اسی حصہ کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ " لا مبدل لکلمات اللہ (الانعام ۳۴) یعنی اللہ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ اسلام کا وہ حصہ ہے جس میں عقیدہ، اخلاقی اقدار اور بنیادی اصول حیات شامل ہیں۔ یہ تعلیمات سب کی سب ابدی ہیں۔ حالات میں کوئی بھی تبدیلی ان کی قدر و قیمت کو بدلنے والی نہیں۔ مثلاً خدا کو ایک جاننا یا سچ بولنا یا تمام انسانوں کو خون شریک بھائی (blood brothers) سمجھنا وغیرہ۔

تاہم یہاں بھی حالات کی ایک رعایت پیشگی طور پر رکھ دی گئی ہے اور وہ قانون اضطرار ہے۔ اس قانون کے مطابق انسان بس اتنے ہی کا مکلّف ہے جتنا اس کے بس میں ہو (البقرہ ۲۸۶) مثلاً اگر حالات کا شدید تقاضا ہو تو اجازت ہے کہ آدمی توحید کو صرف دل سے مانے، وہ زبان سے اس کا اعلان و اظہار نہ کرے۔ تکلیف بقدر وسع کا اصول ایک عام اصول ہے اور وہ عقیدہ سے لے کر عمل تک ہر چیز پر محیط ہے۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا اصول وہ ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ **اتنم اعلم بامور دنیاکم** (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۱۸) یعنی تم اپنے دنیا کے معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ یہ حدیث ابتدائی طور پر تأبیر نخل، بالفاظ دیگر، باغبانی (horticulture) کے بارے میں آئی ہے مگر توسیعی مفہوم کے اعتبار سے اس میں وہ تمام امور شامل ہو جاتے ہیں جن کا تعلق تعمیر دنیا سے ہے نہ کہ نجات آخرت سے۔ یہ اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم رہنما اصول ہے۔ اس نے نجات آخرت کے امور اور تعمیر دنیا کے امور کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اس کے مطابق، اہل اسلام کو اخروی نجات والے معاملات میں قرآن و سنت سے ہدایت لینا ہے۔ اور جو امور معاملات دنیا کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بارے میں اپنی تحقیق و ریسرچ کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے۔ اس میں صنعت و زراعت کے تمام شعبے اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تمام شاخیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اہل اسلام کو یہ آزادی مل جاتی ہے کہ کسی اعتقادی بندش کے بغیر خالص علمی ریسرچ کی روشنی میں اپنے معاملات کا انتظام و انصرام کرتے رہیں۔

ان معاملات میں اسلام صرف وہاں دخل دے گا جہاں کوئی بات صراحۃً اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ مثلاً ہوائی جہاز کی انڈسٹری کیسے قائم کی جائے اس میں اسلام کی طرف سے مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ البتہ اگر یہ سوال ہو کہ ہوائی جہاز کے مسافروں کو سافٹ ڈرنک دیا جائے یا شراب تو یہاں اسلام یہ کہے گا کہ انہیں شراب کے بجائے سافٹ ڈرنک دینا چاہئے۔

۳۔ اس سلسلہ کی تیسری اہم تعلیم وہ ہے جو پیغمبر اسلام کے ایک اسوہ سے نکلتی ہے۔ مدنی دور میں ایک شخص (مسیلمہ) نے یہ اعلان کیا کہ میں بھی خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ کو محمد کے ساتھ پیغمبری میں شریک کیا گیا ہے (سیرت ابن ہشام ۴/۲۴۴)۔ اس مدعی نبوت کے دو سفیر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ اس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جو ہمارے صاحب کی رائے ہے وہی ہماری رائے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ دستور نہ ہوتا کہ سفیروں کو قتل نہ کیا جائے تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا (سیرۃ ابن کثیر ۴/۹۸) یہ کہہ کر آپ نے انہیں واپس بھیج دیا۔

اس سے ایک اہم اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملات جو اپنی نوعیت میں بین اقوامی (انٹر نیشنل) ہوں اور جن کے بارے میں واضح بین اقوامی روایات قائم ہو چکی ہوں ان میں اسلام کا بھی وہی اصول ہو گا جو مختلف قوموں کے درمیان عالمی سطح پر مان لیا گیا ہے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں عام طور پر جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج تھا چنانچہ اسلام میں بھی ایک مدت تک وہ اسی طرح رائج رہا مگر اب چونکہ اس معاملہ میں عالمی دستور بدل چکا ہے اس لئے اب اس پر عمل بھی نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ عراق-ایران جنگ ۸۸-۱۹۸۰ میں دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جنگی قیدی پکڑے گئے۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی غلام نہیں بنایا گیا۔ بلکہ ایک مدت تک قید میں رکھنے کے بعد تبادلہ کی بنیاد پر انہیں رہا کر دیا گیا۔

۴۔ کچھ امور وہ ہیں جن میں کچھ پہلو اتفاق کے ہوں، کچھ پہلو اختلاف کے۔ ایسے امور میں اسلام کا موقف بالکل واضح ہے۔ حالات کے مطابق، اس طرح کے معاملات میں بقدر ضرورت ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایسے مواقع پر آئیڈیل اپروچ کے بجائے پریکٹیکل اپروچ

اسلام کا طریقہ ہو گا۔

اس سلسلہ میں سیکولرزم اور ڈیماکریسی اس کی واضح مثالیں ہیں۔ سیکولرزم کا مطلب ہے مذہب کو ذاتی دائرے میں رکھ کر بقیہ معاملات میں وہ طریقہ اختیار کرنا جس میں سماج کا مجموعی مفاد شامل ہو۔ مخصوص حالات میں اس کو اسلام میں بھی اختیار کیا جائے گا۔ اس کی ایک مثال خود پیغمبر کی زندگی میں مدنی دور کا ابتدائی نصف زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں مدینہ کی ابتدائی اسٹیٹ میں جو نظام اختیار کیا گیا وہ اپنے عملی ڈھانچہ کے اعتبار سے کم و بیش وہی تھا جس کو موجودہ زمانہ میں سیکولرزم کہا جاتا ہے۔

۵۔ ان سب کے باوجود ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ امور ایسے ہوں جن میں اسلام کا اور بدلی ہوئی دنیا کا اختلاف باقی رہے۔ ایسے معاملات کے لئے اسلام میں کیا ہدایت ہے اس کا جواب قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے کہ تم لوگوں کو نصیحت کرتے رہو، کیوں کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو، تم لوگوں کے اوپر داروغہ نہیں ہو (الغاشیہ)۔

اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ اس قسم کے اختلافی امور میں دونوں فریقوں کے درمیان ڈائیلاگ ہو گا۔ اہل اسلام دوسروں کو اپنی پوزیشن بتانے کی کوشش کریں گے۔ خالص پر امن انداز میں یہ کوشش جاری رہے گی کہ حق واضح ہو، اور لوگ دلیل کی زبان سے مطمئن ہو کر حق کو قبول کر لیں۔

تاہم یہ سارا کام صرف پر امن ترغیب کے دائرہ میں ہو گا، کسی بھی حال میں کوئی متشددانہ طریقہ استعمال نہیں کیا جائے گا خواہ یہ اختلافات ختم ہو جائیں یا بدستور لمبی مدت تک باقی رہیں۔ یہ اصول اس بات کا ضامن ہے کہ اسلام کی پوزیشن فکری طور پر لوگوں کے اوپر واضح ہو جائے۔ اہل اسلام اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کو اس سے پوری طرح باخبر کر دیں۔

اس کی ایک مثال مرد اور عورت کی صنفی مساوات (gender equality) کا مسئلہ ہے، اس معاملہ میں اسلام اور جدید مغرب کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہے۔ وہ یہ کہ جدید مغرب کا یہ کہنا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کا ورک پلیس (مقام کار) ایک ہے۔ مگر اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں تک عزت، احترام اور انسانی حقوق کا سوال ہے، دونوں کے درمیان مکمل مساوات ضروری ہے۔ لیکن جہاں تک ورک پلیس کا تعلق ہے

دونوں کا ورک پلیس بنیادی طور پر الگ ہوگا۔ کیونکہ حیاتیات اور نفسیات کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان فرق پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کے سوال پر اسلام اور مغرب کے درمیان پچھلے سو سال سے رسمی اور غیر رسمی سطح پر ڈائیلاگ جاری ہے اگرچہ ابھی تک اس معاملہ میں دونوں کے درمیان کوئی اتفاق رائے ممکن نہ ہو سکا۔

اسلام کا رول

بہتر دنیا کی تعمیر میں اسلام کا ایک مستقل رول ہے۔ یہ رول اسلام کے ابتدائی زمانہ سے لےکر بعد کے زمانوں تک جاری رہا ہے اور مسلسل جاری رہیگا۔ یہاں مختصر طور پر اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو قدیم عرب میں قبائلی نظام تھا۔ ان کا کلچر انتقام کے اصول پر قائم تھا۔ ان کے یہاں جب اس قسم کا کوئی ایک واقعہ پیش آتا تو فریق ثانی کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ اس کا انتقام لے۔ اس کے بعد انتقام کا انتقام لینے کی صورت میں یہ تباہ کن سلسلہ برابر جاری رہتا۔ یہ صورت حال قدیم عربوں کی ترقی میں مستقل رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے انتقام کلچر کی جگہ معافی کلچر کو رواج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کے لئے ہر قسم کی ترقی کا دروازہ کھل گیا۔

۲۔ موجودہ زمانہ میں بھی اس قسم کی کئی چیزیں ہیں جہاں اسلام اپنا مثبت رول ادا کر سکتا ہے۔ مثلاً انفرادی آزادی بہت قیمتی چیز ہے مگر جدید مغربی تہذیب نے آزادی کو خیر مطلق (summum bonum) قرار دے کر اس کو لامحدود حد تک وسیع کر دیا۔ اس لامحدود آزادی کے بے شمار نقصانات ہیں جن کو آج دنیا مختلف صورتوں میں بھگت رہی ہے۔

تمام اہل دانش یہ مانتے ہیں کہ آزادی بلاشبہ ایک خیر ہے مگر لامحدود آزادی شر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جدید تہذیب یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آزادی کو محدود کس طرح کیا جائے اور کس کے مقابلہ میں کیا جائے۔ یہاں اسلام یہ رہنمائی دیتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی آزادی کو خدا کے مقابلہ میں محدود بنائے۔ انسان کے مقابلہ میں آزادی کو محدود کرنا بظاہر ناقابل فہم ہے مگر خدا کے مقابلہ میں آزادی کا تصور فوراً قابل فہم ہو جاتا ہے۔

اس نوعیت کی ایک کامیاب مثال اس سے پہلے سامنے آچکی ہے۔ پچھلے پانچ ہزار سال سے یورپ فلسفیوں کے اس تصور سے مسحور تھا کہ انسانی عقل حقیقت کلی تک پہنچ سکتی ہے۔ مگر اس رخ پر ہزاروں سال کی کوشش کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچ سکی۔

اسلام نے اس معاملہ میں یہ رہنمائی دی کہ عقل انسانی صرف جزئی حقیقت کا احاطہ کر سکتی ہے، وہ کلی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی (وما اوتیتم من العلم الا قلیلا)۔ اس محدودیت کی بنا پر حقیقت کلی کو عقل کے ذریعہ دریافت کرنے کی کوشش ایک بے فائدہ کوشش ہے جو کبھی کسی واقعی نتیجہ تک پہنچنے والی نہیں۔

قرون وسطیٰ میں جب اسلامی فکر یورپ میں پھیلا تو اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ ذہن بنایا کہ سائنسی ریسرچ کے دائرہ کو محدود رہنا چاہئے۔ اب یورپ کے اہل علم نے اشیاء کے معنوی پہلو کو اس کے مادی پہلو سے الگ کر دیا۔ وہ معنوی پہلو کو چھوڑ کر چیزوں کے مادی پہلو پر ریسرچ کرنے لگے۔ اس طرح اچانک سائنسی تحقیق بے فائدہ کوشش کے میدان سے نکل کر نتیجہ خیز عمل کے میدان میں داخل ہو گئی۔ ''علم کثیر'' کو چھوڑ کر ''علم قلیل'' پر راضی ہونے کا یہی اصول تھا جو جدید سائنسی تہذیب کو وجود میں لانے کا سبب بنا۔

اسی طرح جدید مغرب ایک اور سحر میں مبتلا ہے۔ یہ لا محدود آزادی کا سحر ہے۔ مگر دوبارہ فطرت کا قانون اس کے لئے ایک مستقل رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ وہ یہ کہ لا محدود آزادی کے تصور کے تحت کبھی کوئی بہتر سماج نہیں بنایا جا سکتا۔ یہاں دوبارہ اسلام ایک عظیم رہنمائی دے رہا ہے۔ وہ یہ کہ انسان محدود آزادی پر راضی ہو جائے۔ کیونکہ موجودہ دنیا میں صرف یہی ممکن ہے۔

لا محدود آزادی کے تصور نے دنیا کو انارکی کا جنگل بنا دیا ہے۔ محدود آزادی کا اصول دنیا کو امن اور سکون کا سماج بنا سکتا ہے۔ یہ دوسرا اصول اسی طرح جدید دنیا میں ایک نیا انقلاب لا سکتا ہے جس طرح پہلا اصول قدیم دنیا میں ایک عظیم انقلاب لایا تھا۔

قوت مرهبه

قرآن میں صبر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ تم لوگ اپنے بچاو کا انتظام رکھو (النساء ۷۱)۔ قرآن میں فرمایا کہ صلح بہتر ہے (النساء ۱۲۸) اسی کے ساتھ قرآن میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اپنے دشمنوں کے لئے قوت مرھبہ فراہم کرو (الانفال ۶۰)۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی میں بیک وقت دو قسم کی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک طرف یہ کہ آدمی لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرے، وہ نزاع کے موقع پر صلح اور مفاہمت کے لئے تیار رہے دوسری طرف یہ کہ آدمی لوگوں کے شر سے بچنے کی تدبیر کرے، وہ اپنے ساتھ ایسی قوت جمع کرے جو لوگوں کو اس کے بارے میں خوف زدہ کرنے والی ہو۔

تاہم ان دونوں قسم کی چیزوں کی اہمیت یکساں نہیں۔ ان میں سے ایک کی حیثیت اصل کی ہے اور دوسری کی حیثیت وقتی ضرورت کی۔ آدمی کو چاہئے کہ اس کی زندگی کا اصل اصول تو یہی ہو کہ وہ صبر واعراض کی نفسیات کے ساتھ دنیا میں رہے۔ اگر کسی سے اس کو تکلیف پہنچ جائے تو وہ اس کو معاف کر دے اور پہلے ہی مرحلے میں مصالحت کر کے معاملے کو ختم کر دے۔

مگر یہ دنیا آزادی کی دنیا ہے۔ یہ آزادی جو برائے امتحان دی گئی ہے وہ اکثر لوگوں کو سرکش بنا دیتی ہے۔ آدمی اپنی انانیت اور سرکشی کی بنا پر وہ چیز چاہنے لگتا ہے جو از روئے انصاف اس کا حق نہیں، ایسے لوگ موقع پاتے ہی دوسروں کو اپنی سرکشی کا نشانہ بنانے لگتے ہیں۔ وہ دلیل کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، البتہ اگر طاقت کا سامنا ہو تو وہ جھک جائیں گے۔

یہی وہ دوسری ضرورت ہے جس کے لئے اہل ایمان کو قوت مرھبہ فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کو صابر اور صلح پسند ہونے کے ساتھ یہ بھی کرنا چاہئے کہ وہ اپنے ارد گرد ایسے سباب جمع رکھے جو سرکش انسانوں کے لئے روک کا کام دیں۔ جن کو دیکھ کر شریر لوگ اس طرح خوف زدہ ہو جائیں کہ وہ اپنے آپ مومن کو اپنی سرکشی کا نشانہ بنانے سے باز رہیں۔

جھوٹ کی اشاعت

نوائے وقت پاکستان کا مشہور اردو روزنامہ ہے جو تقریباً ۶۰ سال سے جاری ہے۔ وہ پاکستان کے پانچ شہر (لاہور، کراچی، راولپنڈی، اسلام آباد، ملتان) سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس کی لاہور کی اشاعت مورخہ ۷ اپریل ۱۹۹۸ (۹ ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ) میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ یہ اس کے صفحہ آخر سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۱۱ پر مکمل ہوئی ہے۔ نوائے وقت کی یہ خبر اس کے عنوان کے ساتھ بجنسہ یہاں درج کی جاتی ہے:

مولانا وحید الدین خان پر نئی دہلی میں قاتلانہ حملہ

نئی دہلی (جی این این) بھارت کے متنازعہ مصنف اور اسکالر وحید الدین خان صبح ایک قاتلانہ حملہ میں بال بال بچ گئے۔ حملے کے باعث ان کی کار کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ وحید الدین خان اپنے دفتر واقع نیو دہلی میں داخل ہو رہے تھے کہ نامعلوم افراد نے لاٹھیوں اور ہاکیوں سے ان پر حملہ کر دیا۔ پولیس نے چھ افراد کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔ متنازعہ مصنف نے حال ہی میں بدنام زمانہ مصنف اور گستاخ رسول سلمان رشدی کے دفاع میں ایک متنازعہ کتاب لکھی ہے۔ کتاب میں ایرانی پیشوا آیت اللہ خمینی کی طرف سے سلمان رشدی کے قتل کے فتوی کی مذمت کی گئی۔ سلمان رشدی کے حامی مصنف کے بیٹے نے کہا کہ یہ کارروائی حکومت ایران کے ایما پر کی گئی ہے۔

(ختم)

۱۔ یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے۔ ایسا کوئی واقعہ خدا کے فضل سے میری زندگی میں کبھی پیش نہیں آیا نہ دہلی میں اور نہ کہیں اور۔ مجھے تعجب ہے کہ اتنی زیادہ بے اصل خبر کیسے وضع کی گئی اور کیسے وہ ایک موقر مسلم اخبار میں شائع ہوئی۔

۲۔ خبر میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ فرضی واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا۔ جس نیوز ایجنسی کے حوالے سے یہ خبر شائع کی گئی اس کا نام جی این این درج ہے۔ میرے علم کے مطابق یہ کوئی نیوز ایجنسی نہیں ہے، وہ صرف ایک فرضی نام ہے۔ اور نہ اس قسم کی کوئی خبر مقامی پولیس کے دفتر میں درج ہے۔

۳۔ خبر میں راقم الحروف کو متنازعہ شخصیت بتایا گیا ہے۔ یہ ایک لغو بات ہے۔ متنازعہ مسلم شخصیت

وہ ہے جو اسلام کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کرے ۔ میں خدا کے فضل سے مکمل طور پر اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ اور مسلک پر ہوں ۔ میں نے اس سے نہ کلی انحراف کیا ہے اور نہ جزئی انحراف ۔ ایسی حالت میں مجھ کو متنازعہ شخصیت کہنا بلاشبہ ایک شرانگیز بات ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ بعض لوگوں نے کسی معاملہ میں مجھ سے اختلاف کیا ہے ۔ مگر اس قسم کا اختلاف ایک فطری چیز ہے ۔ اسلامی تاریخ کی تمام بڑی بڑی شخصیتوں سے کسی نہ کسی نے بعض معاملات میں اختلاف کیا ہے ۔ مگر محض اس بنا پر یہ لوگ متنازعہ شخصیت نہیں بن جاتے ۔

موجودہ زمانہ میں مسٹر محمد علی جناح سے کانگریسی مسلمانوں اور جمعیۃ علماء ہند سے وابستہ علماء نے اختلاف کیا ۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے مسلم لیگی قائدین نے اختلاف کیا ۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ہندوپاک کے بہت سے علماء نے اختلاف کیا ۔ مگر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ اس اختلاف کی بنا پر مسٹر محمد علی جناح ، مولانا حسین احمد مدنی ، مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی متنازعہ شخصیت تھے ۔ ایسی حالت میں صرف بعض اختلاف کی بنا پر مجھ کو متنازعہ شخصیت کہنا غیر علمی بھی ہے اور غیر اسلامی بھی ۔

۴ ۔ راقم الحروف کی کتاب "شتمِ رسول کا مسئلہ" کوئی حالیہ کتاب نہیں ۔ وہ بہت پہلے شائع ہو چکی ہے ۔ یہ کتاب نہ امام خمینی کے فتوے کی مذمت میں لکھی گئی ہے اور نہ سلمان رشدی کی حمایت و مدافعت میں ۔ وہ شتمِ رسول کے مسئلہ کا خالص علمی اور تاریخی تجزیہ ہے ۔ مزید یہ کہ اس کتاب میں مسئلہ کے بارے میں جو نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے وہ مصنف کا محض انفرادی نقطۂ نظر نہیں ۔ دوسرے ایسے علماء بھی موجود ہیں جو ٹھیک اسی نقطۂ نظر کے حامی ہیں ۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف سعودی عرب کے مشہور عالم ہیں ۔ اس مسئلہ میں ان کی عین وہی رائے ہے جس کا اظہار راقم الحروف نے اپنی کتاب میں کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو ، شتمِ رسول کا مسئلہ ، صفحہ ۱۸۹ ۔

۵ ۔ مسلم صحافت ، خاص طور پر اردو صحافت میں اس قسم کی خبروں کی اشاعت کوئی انوکھی بات نہیں ۔ تقریباً ہر روز ان اخباروں میں اس قسم کے بے بنیاد قصے چھپتے رہتے ہیں ۔ مگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو یہ کوئی سادہ بات نہیں ، یہ بے حد سنگین بات ہے ۔

مشہور لبنانی مفکر خلیل جبران (۱۹۳۱ - ۱۸۸۳) نے کہا تھا کہ ــــــــ درخت کا ایک

پتہ بھی پورے درخت کی خاموش رضامندی کے بغیر زمین پر نہیں گرتا :

Not a single leaf falls down without the
silent consent of the whole tree.

یہ بات عقل اور اسلام دونوں اعتبار سے بالکل درست ہے۔ اسی لیے اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی معاشرہ میں جب ایک شخص برائی کرے تو پورے معاشرہ کا فرض ہے کہ وہ برائی کرنے والے کا ہاتھ پکڑے ۔ اگر معاشرہ ایسا نہ کرے تو دونوں ہی اس برائی کے ذمہ دار ٹھہریں گے، برائی کرنے والا براہ راست طور پر اور معاشرہ بالواسطہ طور پر۔

دہلی کے مسلم ہفت روزہ الجمعیۃ کا شمارہ ۲۴ - ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ کو دیکھئے۔ اس کے صفحۂ اول پر جلی حرفوں میں یہ عنوان درج ہے : سنگھ (آر ایس ایس) کی مسلمانوں کو بدنام کرنے کی سازش ۔

یہی حال دنیا بھر کے تمام مسلم اخبارات و رسائل کا ہے ۔ ان اخبارات میں ہر روز اسی طرح غیر مسلموں کی زیادتیوں اور سازشوں کی مذمت درج ہوگی مگر مسلمانوں کی زیادتیوں کی مذمت کبھی کسی اخبار میں نہیں چھپتی ۔ موجودہ زمانہ میں مسلم معاشرہ کا حال یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر جھوٹا الزام لگاتا ہے ۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی کردار کشی کرتا ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو پر حملہ کرتا ہے ۔ یہ سب کچھ بہت بڑے پیمانہ پر ہر روز ہو رہا ہے ۔ مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ ان واقعات کی مذمت نہیں کرتے ، نہ قلمی اور نہ زبانی ۔ ایک دوسرے کی غیبت کی آوازوں سے تو مسلمانوں کی مجلسیں بھری ہوئی ہیں ۔ مگر غلط کاروں کی کھلی مذمت کے لیے نہ کسی کے پاس زبان ہے اور نہ قلم ۔

یہی وہ کمی ہے جس نے موجودہ صورت حال پیدا کی ہے ۔ اگر ہمارا معاشرہ ایک زندہ معاشرہ ہو، اگر اس کے افراد میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح موجود ہو، اگر ملت کے افراد میں یہ تڑپ ہو کہ وہ برائی کو دیکھ کر چپ نہ رہ سکیں تو ساری صورت حال یکسر بدل جائے گی ۔ اس کے بعد کسی کو مذکورہ قسم کی جھوٹی خبر وضع کرنے کی ہمت ہی نہ ہوگی ۔ کوئی مسلمان اس کی جرأت نہیں کرے گا کہ وہ دوسرے مسلمان کو بدنام کرنے کی کوشش کرے ۔

موجودہ مسلم معاشرہ میں کوئی شخص ایسا نہیں کرتا کہ وہ کعبہ کے بارہ میں توہین آمیز الفاظ بولے ۔

یا کعبہ کی توہین میں کوئی بیان اخبار میں چھپوائے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ کے بارہ میں مسلم معاشرہ انتہائی حد تک حساس ہے۔ کوئی شخص کعبہ کے خلاف بے ہودہ بات کہے تو فوراً سیکڑوں آدمی اس کے مواخذہ کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ معاشرہ کا یہ خوف لوگوں کو کعبہ کے خلاف لکھنے اور بولنے میں طاقت ور رکاوٹ بن گیا ہے۔ مگر جہاں تک مسلم افراد کا تعلق ہے، کوئی بھی مسلمان کسی بھی مسلمان کے خلاف لغو باتیں کرنے لگتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ کی حرمت کے بارہ میں جو حساسیت مسلم معاشرہ میں پائی جاتی ہے، وہی حساسیت مسلمان کے بارہ میں موجود نہیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی حرمت کعبہ کی حرمت سے زیادہ ہے (حرمة المومن اكرم حرمة من الكعبة) ایک صحابی کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے کعبہ کو دیکھ کر کہا کہ تیری حرمت بہت زیادہ ہے مگر مومن کی حرمت تجھ سے بھی زیادہ ہے (المومن اعظم حرمة عند الله منك) الترمذی کتاب البر، ابن ماجہ کتاب الفتن، الدارمی کتاب المناسک۔

۶۔ مذکورہ جھوٹی خبر میں راقم الحروف کی کتاب "شتم رسول کا مسئلہ" کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ وہ سلمان رشدی کے دفاع میں لکھی گئی ہے۔ یہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد مسلم دانشوروں کی اس مجرمانہ کمزوری کی ایک مثال ہے جو عام طور سے اس طبقہ میں پائی جاتی ہے۔ وہ ہے کسی کی تصویر بگاڑنے کے لیے اس کی بات کو منحرف صورت میں پیش کرنا۔ راقم الحروف کی کتاب سلمان رشدی کے دفاع سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ وہ مسئلہ شتم کا علمی جائزہ ہے۔ مگر اس کو غلط طور پر رشدی کے دفاع کا نام دے دیا گیا ہے تاکہ مصنف کو بدنام کیا جا سکے۔ کوئی بھی شخص اصل کتاب کو پڑھ کر اس حقیقت کو جان سکتا ہے۔ یہاں اس معاملہ کی وضاحت کے لیے کتاب کے کچھ متعلق حصے نقل کیے جاتے ہیں:

"سلمان رشدی کی کتاب (شیطانی آیات) میں نے خود پڑھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک انتہائی لغو کتاب ہے۔ اس کتاب کی لغویت کے بارہ میں میری وہی رائے ہے جو دوسروں کی رائے ہے (صفحہ ۵۰)۔۔۔ مسلم رہنما اگر اس معاملہ کی تحقیق کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ سلمان رشدی کی کتاب اگرچہ نہایت بے ہودہ ہے، مگر اسی کے ساتھ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ ناقابل مطالعہ

بھی ہے ۔ وہ کوئی تخلیقی ناول نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے وہ اتنی پست اور اتنی غیر دلچسپ ہے کہ وہ سرے سے اس لائق ہی نہیں کہ کوئی شخص اس کو شروع سے آخر تک پڑھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی موت آپ مر جاتی ۔ اس میں کسی قسم کی کوئی زندگی نہیں ۔ یہ صرف مسلمانوں کا احمقانہ شور وغل ہے جس نے اس کو غیر ضروری طور پر زندہ کر دیا ۔ (صفحہ ۹۰) واقعہ یہ ہے کہ سب وشتم اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر ایک اعتراض ہے ۔ اور جو شخص اسلام اور پیغمبر اسلام پر اعتراض کرے اس کی زیادہ بڑی سزا یہ ہے کہ اس کی بات کو دلیل کے ذریعہ رد کر دیا جائے ۔ اس کو گولی مارنا اگر اس کا جسمانی قتل ہے تو اس کے اعتراض کو رد کرنا اس کا ذہنی قتل ۔ اور جسمانی قتل کے مقابلہ میں ذہنی قتل بلاشبہ زیادہ سخت ہے اور زیادہ کارگر بھی (صفحہ ۷۸)

حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب فتویٰ دینے والوں کی غیر عاقلانہ روش کا تجزیہ ہے، وہ کسی بھی درجہ میں سلمان رشدی کی مدافعت یا حمایت نہیں ۔

۷۔ راقم الحروف کی کتاب "شتم رسول کا مسئلہ" ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کا ذیلی ٹائٹل ان الفاظ میں دیا گیا ہے —— قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں ۔ راقم الحروف نے یہ کتاب لمبی تحقیق کے بعد مرتب کی ہے ۔ ایک تعلیم یافتہ شخص نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ان الفاظ میں اس پر تبصرہ کیا کہ یہ کتاب سلمان رشدی (یا اس کے جیسے دوسرے افراد) کا گویا علمی ذبیحہ ہے ۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کتاب کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وقت کے مسلّم ہتھیار کو اسلام دشمنوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے ۔ آج کا ذہن تشدد کے بجائے سائنٹفک دلیل کو وزن دیتا ہے اور آپ نے اسی وزن دار ہتھیار کو اسلام دشمن کے خلاف کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اگر کھلے ذہن کے تحت اس کتاب کو پڑھے تو وہ اس تبصرہ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوگا ۔ وہ کہے گا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام دشمنوں کا جواب دینے کے لیے ہمارے پاس دلائل کا بم موجود ہے مگر ہم مناظروں اور فتووں کی کنکریاں ان کی طرف پھینک رہے ہیں ۔

۸۔ مذکورہ قسم کی ایک خبر کا اخبار میں چھپنا اور شائع ہونا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کو پہلے ایک یا چند انسانوں نے سوچا اور لکھا۔ پھر وہ اخبار کے دفتر میں نیوز ایڈیٹر کے میز پر پہنچی۔ اس کے بعد کسی نے اس کی کتابت کی یا اس کو ٹائپ کیا۔ پھر کسی مصحح نے اس کو پڑھا اور پھر کسی سٹ کرنے والے نے اس کو سٹ کیا۔ اس طرح یہ خبر بہت سی آنکھوں کے سامنے سے گذری جن میں سے ہر ایک بلا شبہ مسلمان تھا۔

ان تمام لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو بھی اگر اس خبر کے بارہ میں کھٹک پیدا ہوتی تو وہ اس کو روک دیتا یا راقم الحروف کے دفتر میں ٹیلی فون کر کے تحقیق کرتا۔ مگر اس خبر کا چھپ کر شائع ہو جانا بتاتا ہے کہ ان بہت سے مسلمانوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کے بارہ میں کھٹک پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ خبر آخری انجام تک پہنچ گئی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ مسلم معاشرہ کی اخلاقی حساسیت کا عالم کیا ہے۔ اس معاشرہ میں وہ مزاج غالب ہے جس کو قرآن میں اشاعت فاحشہ (النور ۱۹) کا مزاج کہا گیا ہے۔ ایسے معاشرہ پر سوء ظن کا مزاج اتنا زیادہ غالب ہو جاتا ہے کہ حسن ظن کے بارہ میں وہ اپنی حساسیت کھو دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ حسن ظن اور سوء ظن کے درمیان زیادہ فرق نہیں کرتے۔ وہ جھوٹی خبر کو بھی اسی طرح بیان کرنے لگتے ہیں جس طرح سچی خبر کو۔ وہ الزام تراشی اور بیان واقع کو یکساں درجہ دیتے ہیں، حالانکہ ان میں سے ایک جائز ہے اور دوسرا ناجائز۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کسی کے بارہ میں کوئی بری بات سنتے ہیں تو بلا تحقیق اس کو درست مان لیتے ہیں اور اس کو پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کا احساس نہ ہونے کی وجہ سے وہ غلط بات کی اشاعت بھی اسی طرح کرنے لگتے ہیں جس طرح صحیح بات کی اشاعت کی جانی چاہئے۔ تنقید کے وقت وہ الزام تراشی کی زبان بھی اسی طرح اطمینان کے ساتھ بولتے ہیں جیسے کہ دلیل اور ثبوت کی زبان بولی جاتی ہے۔

موجودہ مسلم معاشرہ بدقسمتی سے سوء ظن کا معاشرہ بن گیا ہے۔ اس لئے اب اس کا حال یہ ہے کہ سوء ظن کی بات فوراً اس کے درمیان قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس حسن ظن کی بات کو قبول کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے۔

سفرنامہ امریکہ

امریکہ میں پچھلے ۲۵ سال کے درمیان تقریباً ایک ہزار اسلامک سنٹر بنائے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مذکورہ سنٹر ہے جو ماؤنٹ ہالی (Mount Holly) میں واقع ہے۔ اس کے صدر مولانا ذکی الدین الشرفی ہیں (Tel. 609-2659370) اس سنٹر کی دعوت پر امریکہ کا سفر ہوا۔ اس سلسلہ میں وہاں کے مختلف مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی مختصر روداد درج کی جاتی ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۹۶ کی رات کو ۱۰ بجے دہلی سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک جگہ ریڈ لائٹ پر ہماری گاڑی رکی۔ اتنے میں ایک اور گاڑی آکر وہاں کھڑی ہوگئی۔ اس کے اندر تیز آواز میں گانے اور باجے کا کیسٹ بج رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ لوگ خارجی چیزوں میں اتنا محو ہیں کہ انھیں اندرونی حقیقتوں کے بارہ میں سوچنے کا موقع نہیں۔ لوگ پُرشور آوازوں کے درمیان جیتے ہیں، پھر کیوں کر انھیں فطرت کی خاموش آوازیں سنائی دیں گی۔ لوگ مخلوق کے کثیف نغموں میں بدمست ہو رہے ہیں، پھر وہ خالق کے لطیف نغموں کا ادراک کس طرح کر سکتے ہیں۔

برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۴۴ کے ذریعہ دہلی سے لندن کے لیے روانگی ہوئی۔ دہلی میں نواب ظفر جنگ صاحب نے کہا تھا کہ "آپ ایک آتھر ہیں۔ آپ اپنی کوئی انگریزی کتاب ساتھ لے جائیے اور اس کو فلائٹ کیپٹن کو بطور گفٹ دیجئے۔ ان لوگوں کی نفسیات کے اعتبار سے میں کہتا ہوں کہ وہ اس کو اپنے لیے آنر سمجھیں گے اور خوش ہو کر اس کو پڑھیں گے۔

اس مشورہ کے مطابق، میں ایک پیکٹ میں ایک انگریزی کتاب اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ دوران پرواز اس کو فلائٹ کیپٹن کو دیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کا نام کیپٹن ٹونی (Tony Gepaian) تھا۔ اس نے کہا کہ پرواز کے دوران تو میں مصروف رہوں گا۔ اس لیے ابھی فوراً نہیں پڑھ سکتا۔ مگر ٹھکانے پر پہنچ کر میں ضرور اس کو پڑھوں گا۔

ساڑھے آٹھ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز لندن میں اترا۔ اس وقت ۲۱ اگست

کی تاریخ تھی اور لوکل ٹائم کے لحاظ سے صبح ۵ بجے کا وقت تھا۔ ایرپورٹ پر فجر کی نماز ادا کی۔ ضروریات کے لیے میں معذوروں کے ٹائلٹ میں چلا گیا۔ وہ نہایت کشادہ اور نہایت مکمل اور نہایت صاف ستھرا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی اسلامی تصور حیات کا ایک اظہار ہے۔ قرآن میں ہے کہ وفی اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم (الذاریات ۱۹) اس آیت میں "معلوم" کا ایک مطلب ہے شریعت کے ذریعہ معلوم حق۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دینے والا محروم کی ضرورتوں کو جان کر خود یہ طے کرے کہ کس چیز کی اسے ضرورت ہے۔ وہ اس کی ضرورتوں کو بطور خود جان کر اس کے مطابق اس کا اہتمام و انتظام کریں۔ موجودہ ترقی یافتہ ملکوں میں معذوروں کے لیے جو اہتمام کیا جاتا ہے وہ اس کی ایک کامیاب مثال ہے۔

لندن ایرپورٹ کی ایک ایک چیز دہلی کے انٹرنیشنل ایرپورٹ سے بہت زیادہ بہتر دکھائی دی۔ اس فرق کا مطلب یہ سمجھ میں آیا کہ ہندستان میں جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا وہ پیسہ پرستی کا مزاج رکھتے تھے۔ وہ پیسہ کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ملے ہوئے اقتدار کو پیسہ لوٹنے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے برعکس مغربی ملکوں میں معیار پرستی کا مزاج تھا۔ اس لیے یہاں کے حکمرانوں نے اپنے قومی معیار کو بلند کیا۔

لندن سے نیویارک کے لیے برٹش ایرویز کی فلائٹ ۱۱۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جس وقت جہاز تیزی کے ساتھ پرواز کر رہا تھا، میرے دل میں آیا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ دہلی سے دور نیویارک سے قریب ہو رہا ہے۔ یہی حال خود انسان کا ہے۔ انسانی زندگی ایک مسلسل سفر ہے۔ اور ہر انسان لمحہ بہ لمحہ دنیا سے دور اور آخرت سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

سفر کے دوران جہاز میں مسافروں کی تفریح کے لیے فلمیں دکھائی جا رہی تھیں۔ لوگ ہیڈ ایڈ لگائے ہوئے اس کو دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی میری نظر بھی پڑ جاتی تھی۔ ایک بار قدرتی مناظر دکھائے گئے۔ یہ نہایت خوب صورت تھے، میں ان کو دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ فطرت کے حسن کی صورت میں خدا نے اس دنیا میں جنت کا تعارف رکھ دیا ہے۔ البتہ دو چیزوں کا تجربہ انسان کو صرف آخرت میں ہوگا۔ وہ ہے ایک ایسی زندگی جس

میں حال کی تکلیف اور مستقبل کا اندیشہ شامل نہ ہو (لاخوف علیھم ولاھم یحزنون)

یہ باتیں سوچتے ہوئے جنت کے بارہ میں ایک عجیب خیال ذہن میں آیا۔ میں نے سوچا کہ جنت ایک نفیس ترین کائناتی معاشرہ ہے۔ خدا اور فرشتوں، پیغمبروں اور صالحین کا معاشرہ۔ جنتی انسان اس آفاقی معاشرہ میں رہے گا۔ وہاں نہ حال کا کوئی غم ہوگا اور نہ مستقبل کے بارے میں کوئی خوف۔

لندن سے نیویارک کی پرواز ساڑھے چھ گھنٹہ کی تھی۔ وقت پر جہاز پہنچ گیا۔ تاہم ایرپورٹ کے مراحل سے گزرنے میں دیر لگی۔ کیوں کہ امریکی جہاز (TWA) کے حادثہ کے بعد چیکنگ زیادہ سخت ہوگئی ہے۔ عام ایرپورٹوں پر ٹرالی مفت ہوتی ہے۔ مگر امریکہ میں ٹرالی لینے کے لیے ڈیڑھ ڈالر ادا کرنا پڑتا ہے۔ میرے پاس ۵۰ پنس کا سکہ نہیں تھا۔ مشین میں ایک ڈالر کا نوٹ ڈالا تو اس میں سے فوراً سکہ نکل آیا۔ کتابوں کے دو بنڈل کے لیے مجھے ٹرالی لینا پڑا۔ یہ کتابیں جناب خواجہ کلیم الدین کی فرمائش پر ساتھ لایا تھا۔

ایرپورٹ سے باہر آیا تو خواجہ کلیم الدین صاحب، شاہد تاکلی والا صاحب اور خواجہ صاحب کے صاحبزادے وغیرہ موجود تھے۔ شاہد تاکلی والا یہاں ریسرچ کے ایک ادارہ میں کام کرتے ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ سائنسی طریقہ سے لیمٹ کی جانچ (limit test) کریں۔ دواؤں میں مضر اجزاء مثلاً جست (lead) ڈالا جاتا ہے۔ مگر اس کی ایک حد ہے۔ اگر وہ ملین یا بلین میں ایک حصہ کے بقدر زیادہ ہو تب بھی مشینی جانچ میں اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ انسانی طریقہ ہے جو کسی چیز میں ملاوٹ کی اتنی زیادہ کامیاب جانچ کر سکتا ہے۔ پھر خدا کے یہاں نیتوں کو جانچنے کے لیے جو نظام ہوگا وہ کتنی زیادہ گہرائی کے ساتھ نیتوں کے کھوٹ کو معلوم کر لے گا۔ اس بات کو سوچ کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاہد تاکلی والا صاحب نے بتایا کہ پہلے ملین میں ایک (PPM) کی جانچ ممکن ہوتی تھی۔ اب ٹریلین میں ایک حصہ (PPT) کی جانچ ممکن ہوگئی ہے۔

شاہد تاکلی والا سے میں نے پوچھا کہ امریکہ کی ترقی کا پلس پوائنٹ اور مائنس پوائنٹ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان لوگوں کا پلس پوائنٹ تو یہ ہے کہ وہ تنقید کو نہ صرف یہ کہ

برا نہیں مانتے، بلکہ اس کو ویلکم کرتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں کا فکری ارتقاء مسلسل جاری رہتا ہے۔ اور ان کا مائنس پوائنٹ یہ ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی تو بس ایک کھیل تماشا ہے:

Life is just a fun.

نیویارک میں میرا پہلا قیام خواجہ کلیم الدین صاحب کے مکان پر تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد گھر کے تمام لوگ ایک کمرہ میں اکٹھا ہوئے۔ ان کی خواہش تھی کہ میں انھیں کچھ دین کی باتیں بتاؤں۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک یہ مجلس رہی، نئی جنریشن کی رعایت سے میں نے انگریزی میں گفتگو کی۔ آخر میں سوال و جواب ہوا۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ اسلام اپنے احکام کے اعتبار سے ایک واحد مجموعہ ہے۔ مگر انطباق کے اعتبار سے اس کے تین مرحلے ہیں۔ اور پھر اس کے کئی مرحلے بن جاتے ہیں اور بنتے رہیں گے۔

۲۲ اگست کی صبح کو فجر کے بعد خواجہ کلیم الدین صاحب کے ساتھ نیویارک میں ٹہلنے کے لیے نکلا۔ ہم لوگوں نے تقریباً دو کیلو میٹر کا چکر لگایا۔ یہ علاقہ جس سے ہم لوگ گزرے وہ ایک یہودی علاقہ تھا۔ ہر گھر اور اس کا ماحول نہایت صاف ستھرا نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہودی علاقوں کے مکان نسبتاً مہنگے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ وہ صاف ستھرے علاقہ میں ہوتے ہیں اور اس بنا پر ان کا ٹیکس بھی زیادہ ہوتا ہے۔

امریکہ کے جس شہر میں بھی میں گیا۔ ہر جگہ میں نے پایا کہ فوٹ پاتھ نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ کہیں بھی ہندستانی شہروں جیسے ناہموار فوٹ پاتھ دکھائی نہیں دیے۔ کلیم الدین صاحب نے بتایا کہ اس معاملہ میں یہاں سخت قوانین ہیں۔ اور فوٹ پاتھ کو بنانے اور اس کو درست رکھنے کی ذمہ داری سامنے والے گھر کی ہوتی ہے۔ اگر فوٹ پاتھ ٹوٹا ہوا یا ہموار نہ ہو اور کوئی راہ گیر وہاں چلتا ہوا پھسل کر یا ٹھوکر کھا کر گر جائے اور اس کو جسمانی تکلیف پہنچ جائے تو فوراً وہ عدالت میں مقدمہ (sue) کر دے گا۔ اور پھر گھر والوں کو بہت مہنگا معاوضہ اس کو دینا پڑے گا۔ اس بنا پر گھر والے فوٹ پاتھ کو درست

رکھنے کے معاملہ میں بہت مستعد رہتے ہیں۔

ٹہلتے ہوئے ایک جگہ سڑک کے کنارے ریلوے ویگن کی مانند ایک گاڑی نظر آئی جس میں کوڑا بھرا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں قاعدہ ہے کہ کوئی شخص گھر کی تعمیر یا مرمت کرا رہا ہو تو اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کا ویگن کمپنی سے کرایہ پر حاصل کرے۔ اس کو ڈمپسٹر (dumpster) کہا جاتا ہے۔ سارا ملبہ اس کے اندر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ بھر جاتا ہے تو اس کو کمپنی والے اٹھا لے جاتے ہیں۔ پھر اس کو خالی کرنے کے بعد اسے لاکر دوبارہ اسی مقام پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص گھر کا ملبہ سڑک پر لاکر ڈال دے تو اس کو بھاری جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ وغیرہ۔

ایک بار میں کلیم الدین صاحب کے ساتھ تھا۔ ہم لوگوں نے ایک لفٹ استعمال کی۔ اس کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ لفٹ رُکی تو کلیم الدین صاحب نے دروازہ کھولا۔ اتفاق سے باہر کی طرف ایک سفید فام نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ لفٹ کا دروازہ اس سے ٹکرا گیا۔ کلیم الدین صاحب نے کہا کہ معاف کیجئے (sorry) اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ کوئی بات نہیں (no problem) اور فوراً بات ختم ہو گئی۔

یہ مغربی کلچر ہے۔ بڑے سے بڑا مسئلہ بھی یہاں اسی طرح دو لفظوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ برصغیر ہند میں جو رہنما اٹھے، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں روایات کی اہمیت ہی معلوم نہ تھی۔ وہ صرف آزادی اور غلامی، حاکمیت اور محکومیت کی اصطلاحوں میں سوچنا جانتے تھے۔ اس لیے وہ صرف اس قسم کی باتوں پر جذباتی دھوم مچاتے رہے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں ساری روایتیں ٹوٹ جائیں۔

کوئی سماج سب سے زیادہ جس چیز پر چلتا ہے وہ صحت مند روایات ہیں مگر غالباً ان رہنماؤں کو نہ تو روایات کی اہمیت معلوم تھی اور نہ انھوں نے ایسی روایت کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج برصغیر میں تین آزاد ملک بن گئے ہیں۔ مگر صحت مند روایات سے تینوں محروم ہیں۔ اس محرومی اور تباہی کی آخری حد یہ ہے کہ ان آزاد ملکوں کے لوگ دوبارہ اپنے سابق حکمرانوں کے دیس میں بھاگ کر پہنچ رہے ہیں۔ دہلی

میں میرا ویزا لینے کے لیے جو صاحب امریکی سفارت خانہ گئے، ان کو وہاں کھڑکی کے سامنے چار گھنٹہ تک کھڑا رہنا پڑا۔ کیوں کہ وہاں سڑک تک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔

ایک پاکستانی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ اس کفرستان میں ہم اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ برصغیر ہند کے "کفرستان" میں آپ کو یہی موقع زیادہ بہتر طور پر حاصل تھا۔ وہاں تو آپ نے یہ کام نہیں کیا بلکہ تقسیم کر کے اپنے اور اس کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر لی۔ اور اب آپ نصف کرۂ ارض طے کر کے اس مقصد کے لیے یہاں آئے ہیں، یہ کیسا عجیب ہے۔

فلاڈلفیا میں ایک کتاب دیکھی۔ ۲۸۰ صفحہ کی یہ کتاب اسلامک کونسل آف یورپ (لندن) سے ۱۹۷۶ میں شائع کی گئی ہے۔ اس میں مختلف ممتاز شخصیتوں کے مضامین ہیں۔ اس کا نام ہے:

Islam: Its Meaning and Message

اس کے ایک مضمون میں کہا گیا تھا کہ:

> Contemporary Muslims should be realist enough to understand that they must begin their journey from where they are. A famous Chinese proverb asserts that the journey of a thousand miles begins with a single step. (p. 237)

یہ نہایت درست بات ہے کہ مسلمان جہاں بالفعل ہیں وہیں سے وہ اپنا سفر شروع کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کتاب کو پڑھیں تو اس سے واضح طور پر آپ معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ پہلا قدم کیا ہے جو مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت کے اعتبار سے اٹھانا چاہیے۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا حال یہی ہے۔

۲۲ اگست کو دوپہر بعد ہم لوگ نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سنٹر دیکھنے کے لیے نکلے۔ رہائش گاہ سے ٹریڈ سنٹر تک کا سفر زمین دوز ٹرین کے ذریعہ کیا گیا۔ اس کو یہاں سب وے کہا جاتا ہے اور لندن میں اس کا نام ٹیوب ہے۔ یہاں کی زمین دوز ٹرین دنیا میں سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کو (rapid transit) بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ کار سے بھی زیادہ کم وقت میں

آپ کو منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ کار میں سب سے بڑا مسئلہ پارکنگ کا ہے۔ جبکہ سب وے میں اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کئی عمارتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان میں سے دو عمارتیں زیادہ اونچی ہیں، دونوں کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ یہ بلندی تیز رفتار لفٹ کے ذریعہ صرف ایک منٹ میں طے ہوتی ہے۔ ہم لوگ آخری منزل پر گئے اور اوپر کی چھت پر کچھ وقت گزارا۔ یہ وہی عمارت ہے جس میں مشہور بم دھماکہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی دو منزلوں کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ مگر جلد ہی اس کو اس طرح بنا لیا گیا کہ اب دیکھنے والوں کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ہم لوگ ۱۱۰ ویں منزل سے دیر تک شہر اور سمندر کا منظر دیکھتے رہے۔

ہر طرف نیم برہنہ عورتیں چل پھر رہی تھیں۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ عورتیں آخر اس طرح کیوں رہتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان لوگوں کو مسلسل یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارا جسم تمہارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اس کو چھپانا اپنی شخصیت کے اہم ترین پہلو کو چھپانا ہے۔ اس طرح عورتوں میں اپنے جسم کی نمائش کا ذہن پیدا ہو گیا۔

بعض مسلم ملکوں سے آئے ہوئے نوجوانوں نے کہا کہ جب تک ہم اپنے ملک میں تھے تو ہم اسلام پر فخر کرتے تھے۔ مگر یہاں آکر ہمارا فخر ٹوٹ گیا۔ کیوں کہ اب غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمان ہم کو بہت کم نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ خوش قسمتی سے عین اس موقع پر مجھے الرسالہ مل گیا۔ اس نے مجھے مایوسی میں گرنے سے بچا لیا۔

۲۲ اگست کی شام کو کناڈا (مانٹریل) سے ریاض احمد صاحب (ایک نوجوان طالب علم) کا ٹیلی فون آیا، وہ بہت دیر تک بات کرتے رہے۔ ان کو حال میں الرسالہ ملا ہے وہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اب خدا کے فضل سے اکثر ملکوں میں الرسالہ مشن کی آواز پہنچ چکی ہے۔ ہر جگہ ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو محسوس کر رہے ہیں کہ وہی فکر درست ہے جو الرسالہ میں پیش کی جا رہی ہے۔

۲۲ اگست کی رات کو میں کچھ ویڈیو کیسٹ دیکھ رہا تھا۔ یہ امریکی نومسلموں کے پروگراموں

پرمشتمل تھا۔کہیں ایک سفید فام شخص اپنے لہجہ میں "شہادۃ" ادا کرکے اسلام میں داخل ہورہا ہے۔کہیں اسلام کے تعارف پر کوئی نومسلم تقریر کررہا ہے۔کہیں بہت سے نومسلم بتارہے ہیں کہ میں کیسے اسلام میں داخل ہوا۔کہیں کوئی اپنے مخصوص لہجہ میں اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کر اذان دے رہا ہے۔کہیں کوئی کہہ رہا ہے کہ ان شاء اللہ... ۲ تک امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے بڑھ جائے گی۔

اس کو دیکھتے ہوئے بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔میں نے کہا کہ یہ ایک دعوہ اکسپلوزن ہے جو براہ راست خدا کی مدد سے ہو رہا ہے۔موجودہ دور میں اللہ تعالیٰ نے مذہبی آزادی، کمیونیکیشن اور دوسرے موافق ذرائع پیدا کیے۔یہ اس لیے تھے کہ مسلمان ان کو استعمال کرکے سارے عالم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔مگر مسلمان اس میں ناکام ہوگئے۔ان میں جو لوگ "دعوت" کے نام پر کام کرنے کے لیے اٹھے وہ بھی قومی نفرت اور سیاسی سوچ کی بنا پر صحیح دعوتی اسلوب میں دعوت کو پیش کرنے کا کام نہیں کررہے تھے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود امریکیوں اور دوسری غیر مسلم قوموں میں اسلام کو داخل کردیا۔یہ لوگ صاف ذہن کے تھے، چنانچہ انھوں نے اب زیادہ صحیح اسلوب میں دعوت کا کام شروع کردیا ہے۔

اس قسم کے نومسلم داعی آج کل بہت سے پیدا ہو گئے ہیں۔مثال کے طور پر برطانیہ میں یوسف اسلام، امریکہ میں پروفیسر لینگ (Jeffry Lang) اور امینہ اسلمی (Ameena Assilmi) وغیرہ۔امینہ اسلمی پہلے ڈانسر تھیں۔دس سال پہلے انھوں نے اسلام قبول کیا، اب وہ بوڑھی ہوچکی ہیں۔میں نے ویڈیو کے ذریعہ نیویارک میں ان کی تقریر سنی۔تقریر کا انداز بہت جاذب تھا۔

۲۲ اگست کی صبح کو ہم لوگ ملی مسجد میں گئے اور وہاں فجر کی نماز پڑھی۔جماعت میں تقریباً ۳۵ آدمی تھے۔بیشتر پاکستانی اور بنگلہ دیشی دکھائی دیے۔میں نے سوچا کہ پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمان "مسلم لینڈ" میں باہم مل کر نہ رہ سکے۔اور یہاں "غیر مسلم لینڈ" میں دونوں مل کر پرامن طور پر رہ رہے ہیں۔کیسا عجیب ہے یہ اسلام اور کیسی عجیب ہے یہ اسلامی سیاست۔

امریکہ کے شہروں میں گاڑی کو پارک کرنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ نیویارک کی انتظامیہ نے استثنائی طور پر مسجد کے نمازیوں کو اجازت دی ہے کہ وہ نماز کے دوران دو گھنٹہ تک سامنے کی سڑک پر ڈبل پارکنگ کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں ڈبل پارکنگ سخت جرم ہے اور اس کے لیے بہت بڑا جرمانہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جمعہ کے دن خصوصی طور پر اجازت دی گئی ہے کہ مسجد کے سامنے فٹ پاتھ پر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ اس طرح کی مختلف رعایتیں یہاں کے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ حالاں کہ نیویارک کا میئر ایک یہودی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ وہ کٹر یہودی ہے۔

ایک مجلس میں ایک پاکستانی بزرگ نے سوال کیا کہ پاکستانی مہاجرین کی حالت زار کیوں ہے۔ جب کہ ہندستان میں شرنارتھیوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ حقیقت سننا چاہتے ہیں یا آپ کو اپنی پسند کا جواب چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے نزدیک جو حقیقت ہو وہی بتائیے۔ میں نے کہا کہ ہمارے مسلم لیڈروں نے سیاست بازی تو خوب کی مگر انھوں نے مسلمانوں کو جینا نہیں سکھایا۔ ہماری موجودہ نسل اپنے لیڈروں کی اسی غلطی کی قیمت چکا رہی ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ پاکستان سے جو ہندو انڈیا میں گئے وہ اپنے کو شرنارتھی (پناہ گزیں) سمجھ کر گئے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر وہ وہاں ایڈجسٹ کر کے رہنے لگے۔

اس کے برعکس ہندستان سے جو مسلمان آئے وہ زیادہ تر وہ لوگ تھے جنھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے پاکستان کے نام پر دھوم مچائی تھی۔ چنانچہ وہ اس ذہن کے ساتھ پاکستان گئے کہ ہم اس کے بانی ہیں، ہم فاتحِ پاکستان ہیں۔ اس بنا پر ان کے اندر برتری کی نفسیات بیدار ہو گئی۔ انھوں نے چاہا کہ وہ دوسروں کے اوپر بڑے بن کر رہیں۔ اسی مزاج نے سارے مسئلے پیدا کیے۔

امریکہ کے چیف آف آرمی اسٹاف کولن پاویل (Gen. Collin Powell) کا تعلق سیاہ فام طبقہ سے ہے۔ مگر اپنی صلاحیت کی بنا پر وہ ترقی کر کے اعلیٰ ترین فوجی عہدہ پر پہنچ گیا۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد مشہور ہوا کہ وہ صدارت کے عہدہ کے الکشن میں کھڑا ہونا چاہتا

ہے۔اس کے بعد میڈیا میں اس کا چرچا ہونے لگا۔فروری ۱۹۹۶ میں امریکہ کی مشہور ٹی وی تنظیم اے بی سی کی نمائندہ باربرا والٹر (Barbara Walter) نے ایک انٹرویو کے درمیان کولن پاویل سے پوچھا کہ امریکہ میں سفید فام لوگ سیاہ فام لوگوں کے ساتھ امتیاز (discrimination) برتتے ہیں، اس کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں۔جنرل پاویل نے جواب دیا کہ یہ میرا مسئلہ نہیں، یہ تو ان کا مسئلہ ہے :

Its not my problem. its their problem.

امتیاز اور تعصب کے معاملہ میں یہ بلا شبہ سب سے بہتر جواب ہے جو کوئی زیر تعصب شخص دے سکتا ہے۔

کراچی سے آئے ہوئے ایک مسلمان نے ایک مجلس میں بتایا کہ وہاں شادیوں میں کس طرح بہت زیادہ دھوم مچائی جاتی ہے اور بے پناہ دولت خرچ کی جاتی ہے۔میں نے پوچھا کہ آخر یہ لوگ اپنی کمائی کو شادیوں میں کیوں اتنا زیادہ برباد کرتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ مڈل کلاس یا لوئر کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔پھر انھوں نے کافی پیسہ کما لیا۔اب وہ شادیوں میں نمائش کر کے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اب میں کوئی غریب آدمی نہیں ہوں۔اب میں ایک باعزت شخص کی حیثیت رکھتا ہوں :

I am no longer a poor man. I am a very respectable person.

پاکستان سے انگریزی میں ایک کوارٹرلی قرآنک ہورائزن (The Quranic Horizons) کے نام سے نکلتا ہے۔اس کا شمارہ جنوری ـ مارچ ۱۹۹۶ یہاں دیکھا۔ایک پاکستانی دانش ور کا مضمون تھا۔اس میں انھوں نے پاکستان کی موجودہ حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا کہ غیر ملکی ریڈیو، ناول، میگزین وغیرہ کی آسان دستیابی (easy availability) کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان میں تیزی سے ویسٹرنائزیشن کا عمل ہو رہا ہے۔بظاہر ان کا مطلب یہ تھا کہ اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔ان کے خیال کے مطابق، حکومت اگر ان چیزوں کی آمد پر پابندی لگا دے تو پاکستانی معاشرہ ان کی برائیوں سے محفوظ ہو جائے گا۔

یہ بالکل بے معنی بات ہے۔کسی ملک میں ان چیزوں کی آمد دراصل زمانہ کا تقاضا ہے

نہ کہ حکومت کی پالیسی کا نتیجہ۔ موجودہ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے۔ آج کسی بھی قوم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ دنیا سے الگ اپنا جزیرہ بنا سکے۔ پاکستان میں ضیاء الحق صاحب نے اس قسم کا جزیرہ بنانا چاہا تو پہلے ہی الکشن میں ضیاء الحق کی ٹیم کو عوام نے رد کر دیا۔ ایسی حالت میں نہ تو علاحدہ جزیرہ بنانا ممکن ہے، اور اگر کوئی ایسا جزیرہ بنانے کی کوشش کرے تو جمہوری دور میں اس کا بقا ممکن نہ ہوگا۔

۲۳ اگست کو جمعہ کا دن تھا۔ پروگرام کے مطابق، جمعہ کی نماز یہاں کی مسجد العابدین میں پڑھی۔ جمعہ کا خطبہ اور امامت دونوں میرے ذمہ تھا۔ میں نے خطبہ کے ساتھ انگریزی میں کچھ جمعہ کے بارے میں کہا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے سورہ الجمعہ کا آخری رکوع پڑھا اور پھر انگریزی میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ دینی زندگی کے تقاضے اور معاشی زندگی کے تقاضے دونوں کو کس طرح پورا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں آیات سے اخذ کر کے تین اصول بیان کیے (اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

نماز کے بعد کچھ لوگ مسجد میں ٹھہر گئے ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ: دوسری قومیں ہمارے لئے مدعو ہیں نہ کہ حریف اور رقیب۔

مسجد العابدین کے امام ضمیر ستار صاحب ہیں۔ ان کا تعلق گیانا سے ہے۔ انھوں نے مدینہ کی الجامعۃ الاسلامیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اب یہاں بطور امام خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ انگریزی اور عربی دونوں زبان روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔

مسجد میں جناب سید نایاب حسن رضوی (۵۰ سال) سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: کوئی کہتا ہے کہ امریکہ ہمارا دشمن ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہودی دشمن ہیں۔ کوئی کسی اور کو دشمن بتاتا ہے۔ یہ سب بے معنی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم خود ہی اپنے دشمن ہیں۔

ایک صاحب ہم لوگوں کو اپنے فلیٹ پر لے گئے۔ وہاں ان سے ملا ہوا ایک اور فلیٹ تھا۔ اس کے دروازہ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ میں بنگلہ دیش سے محبت کرتا ہوں:

I love Bangladesh

مجھے نہیں معلوم کہ امریکہ میں مقیم بنگلہ دیشی بھائی نے یہ جملہ کس معنی میں لکھا تھا۔ لیکن مجھے اگر اپنے وطن سے محبت ہے تو میرے لیے میری حب الوطنی کا تقاضا یہ ہوگا کہ میں اپنے وطن میں رہ کر اس کی خدمت کروں، نہ کہ اس کو چھوڑ کر باہر چلا جاؤں۔ چنانچہ یہاں کچھ لوگوں نے پیش کش کی کہ آپ امریکہ میں رہ جائیے، آپ کی زیادہ ضرورت یہاں ہے۔ مگر میرے دل نے کہا کہ ابھی میں اپنے وطن کا حق ادا نہ کر سکا۔ پھر میں اس کو چھوڑ کر یہاں کیسے آسکتا ہوں۔

——— یہ سورہ الجمعہ کی آیتیں ہیں جو قرآن کی ۶۲ ویں سورہ ہے۔ اس میں مختصر طور پر بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں دین اور معاش کے دوطرفہ تقاضے کے درمیان توازن کس طرح رہنا چاہیے۔

معاشی سرگرمی آدمی کی فطری ضرورت ہے۔ اس لیے اسلام میں اس کی مکمل اجازت دی گئی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ معاشی سرگرمیاں دینی تقاضے کے تحت ہوں نہ کہ اس سے آزاد۔ ہر آدمی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی معاش کے لیے دوڑ دھوپ کرے۔

البتہ اس کی چند شرطیں ہیں (۱) اس کو جو کچھ ملے اس کو وہ سراسر اللہ کا فضل سمجھے (۲) معاشی سرگرمیوں کے درمیان وہ خدا کو برابر یاد کرتا رہے (۳) وہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو جائز حدود کے باہر نہ جانے دے۔

معاشی سرگرمی اور دینی تقاضے میں توازن کی صورت یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اور ہر حال میں تیار رہے کہ جب بھی دین کی کوئی پکار سامنے آئے گی وہ معاشی تقاضے کے مقابلہ میں دینی تقاضے کو ترجیح دے گا۔ دینی مطالبہ کو پورا کرنے کے بعد اسے حق ہے کہ وہ دوبارہ اپنی معاشی سرگرمی کی طرف واپس چلا جائے (الجمعہ ۹ - ۱۱)

امریکہ میں مقیم پاکستانی مسلمان ہر سال نہایت اہتمام کے ساتھ یہاں اپنا "قومی میلہ" مناتے ہیں۔ یہ میلہ امریکہ کے مختلف مقامات پر ہوتا ہے۔ نیویارک سے اردو۔ انگریزی میں پاکستانی مسلمان ایک اخبار نکالتے ہیں۔ اس کا نام ہے ——— وطن امریکہ۔ اس کے شمارہ ۲۶ جولائی ۱۹۹۶ میں پورے صفحہ کا ایک اعلان تھا۔ بروکلین میلہ کمیٹی کے زیر اہتمام ساتواں بروکلین میلہ کا اشتہار تھا۔ یہ میلہ ۱۸ اگست ۱۹۹۶ کو ہوا۔ اس کی تفصیل دیتے ہوئے اس میں لکھا تھا:

یاد رکھئے، بروکلین میں کونی آئرلینڈ ایونیو کا یہ میلہ
ہماری قومی شناخت ہے۔

ہندستانی مسلمان اگر ہندستان میں اپنی مسلم شناخت کی دھوم مچائیں، یا پاکستان کے ہندو وہاں اپنی قومی شناخت کا مظاہرہ کریں تو دونوں ملکوں میں اس کا مخالفانہ ردعمل یقینی ہے۔ مگر امریکہ میں ہر ملک کے لوگ اس طرح کی تقریبیں کرتے ہیں اور یہاں کوئی بھی اس کے خلاف کچھ نہیں بولتا —— اسی فرق میں ہندستان اور پاکستان کی بربادی اور امریکہ کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

امریکہ میں پاکستان اور بنگلہ دیش کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ پاکستان پاک لینڈ کے نام پر بنایا گیا اور بنگلہ دیش سونار بنگلہ کے نام پر۔ مگر جب وہ بن گیا تو لوگ اپنے پاک ملک اور اپنے سنہرے ملک کو چھوڑ کر امریکہ بھاگے چلے آرہے ہیں، ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے کہا: یہاں انسان کی قدر ہے۔ اپنے یہاں تو یہ حال ہے کہ کوئی کسی کو بڑھتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ صحیح ہے تو پھر پاک دنیا اور سنہری دنیا کا نعرہ لگانے والوں کو سب سے پہلے انسان بنانے کی تحریک چلانا چاہیے تھا۔

نیویارک میں امان اللہ خان صاحب حیدرآبادی (پیدائش ۱۹۲۰) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پی وی نرسمہاراؤ کے کلاس فیلو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نرسمہاراؤ ہمارے اسکول میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ انھوں نے بہت سے واقعات بتائے۔ مثلاً ایک بار انھیں میتھمیٹکس کے دس سوال دیے گئے اور کہا کہ ان میں سے سات کو حل کیجئے۔ نرسمہاراو نے کہا آپ خود ان میں سات کو چن کر مجھے بتا دیجئے (select any seven) میں نے کہا کہ وہ اچھے پرائم منسٹر ثابت نہ ہو سکے۔ انھوں نے کہا:

· He is only a scholar. He is not a good administrator.

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران ایک لطیفہ بتایا کہ ایک بار ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبہ میں ایک شیعہ عالم سفر کر رہے تھے۔ اس میں عیسائی عالم بھی موجود تھے۔ تعارف کے بعد عیسائی عالم نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ خدا کے محبوب تھے۔ اور محمدؐ غیب کی باتیں

بھی جانتے تھے۔ محمدؐ کو پتہ ہونا چاہیے کہ میرا نواسہ حسین بے دردی کے ساتھ قتل کیا جانے والا ہے۔ پھر محمدؐ نے اپنے خدا سے کیوں نہ کہا کہ اے خدا، میرے نواسے کو قاتلوں کے ہاتھ سے بچالے۔ شیعہ عالم نے کہا: اصل یہ ہے کہ محمدؐ نے خدا سے یہ بات کہی تھی۔ مگر خدا نے جواب دیا کہ اے محمدؐ، میں اپنے بیٹے کو سولی پر چڑھائے جانے سے نہ بچا سکا، پھر تمہارے نواسے کو میں کیسے بچاؤں گا۔

جناب افتخار محمد صاحب (۴۳ سال) نے میری کتابیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ سیاسی اقتدار سے ٹکرانا اور مکمل نظام قائم کرنا امتِ مسلمہ کا نصب العین نہیں۔ حالاں کہ قرآن میں ہے کہ: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (الصف)

میں نے کہا کہ اس آیت کا حکومت اور اقتدار سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ اس کے الفاظ پر غور کیجئے۔ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ کہ دین توحید کو دوسرے دینوں پر غالب کردو۔ اب دیکھئے کہ یہ دوسرے جو ادیان ہیں ان کی نوعیت کیا تھی۔ ان میں سے کوئی بھی مذہب سیاسی اقتدار یا سیاسی نظام کی حیثیت نہیں رکھتا تھا، نہ پہلے اور نہ اب۔ ان میں سے ہر ایک مذہب کی حیثیت صرف اعتقادی یا عبادتی نظام کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان میں سے ہر مذہب الٰہیاتی نظام (theological system) ہے نہ کہ کوئی سیاسی نظام۔

اگر آپ خود ساختہ الفاظ کو آیت میں شامل نہ کریں بلکہ صرف آیت کے الفاظ کی روشنی میں اس کا مفہوم متعین کریں تو وہ یہ ہوگا کہ —— توحید پر مبنی نظریہ کو شرک پر مبنی نظریہ کے اوپر غالب کردو۔

میں نے کہا کہ یہ واقعہ پورے معنی میں ظہور میں آچکا ہے۔ تمام دوسرے ادیان نظری اور فکری اعتبار سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ اب صرف توحید ہے جس کو عالمی سطح پر آئیڈیولاجیکل سپر پاور کی حیثیت حاصل ہے۔

محمد ابراہیم خان صاحب (۴۹ سال) کا ۸ اگست کو دل کا آپریشن (بائی پاس سرجری) ہوا ہے۔ انھوں نے کپڑا ہٹا کر دکھایا۔ پاؤں میں پنڈلی کے مقام سے کھال کو چیر کر آرٹری

نکالی گئی اور اس کو دل کے ساتھ جوڑ دیا۔ سینہ میں بالکل بیچ میں لمبا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس آپریشن پر ۳۰ ہزار ڈالر خرچ ہوئے۔ اور اس کو کرنے والے ڈاکٹر سبرامنیم تھے۔ انھوں نے بتایا کہ چالیس ہزار ڈالر صرف ڈاکٹر سبرامنیم کی فیس تھی۔ وہ اتنے اکسپرٹ ہیں کہ آج امریکہ میں ان کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

اس بار میرا امریکہ کا سفر بہت لمبا تھا۔ ۱۹ اگست ۱۹۹۶ کی شام کو دہلی سے روانہ ہوا۔ اور دوبارہ ۲۱ ستمبر کو دہلی واپسی ہوئی۔ بعض دوستوں نے اخلاص کے تحت اتنا لمبا پروگرام بنا دیا۔ حالانکہ میرے جیسے کمزور آدمی کے لیے اس قسم کا پروگرام بہت زیادہ خلاف مزاج تھا۔

امریکہ میں مجھے ہر قسم کی اعلیٰ سہولت حاصل تھی۔ بظاہر ہر قسم کا آرام تھا۔ مگر میں مسلسل پریشان رہتا تھا۔ ایک دن بھی ایسا نہیں تھا جو چین کے ساتھ گزرا ہو۔ ایک روز بے قراری کے عالم میں بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں نے کہا: خدایا، دنیا میں مجھ کو آرام بھی برداشت نہ ہو سکا۔ پھر آخرت کی تکلیف کو میں کس طرح برداشت کروں گا۔

موجودہ سفر سمیت، امریکہ کے لیے میرے سفروں کی تفصیل یہ ہے:

پہلا سفر	نومبر	۱۹۸۵
دوسرا سفر	دسمبر	۱۹۸۸
تیسرا سفر	نومبر	۱۹۹۰
چوتھا سفر	جنوری	۱۹۹۴
پانچواں سفر	اگست	۱۹۹۶

۲۳ اگست کی شام کو ہم لوگ بذریعہ روڈ پنسلوانیا گئے۔ یہ نیویارک سے ۶۵ میل کا سفر تھا۔ یہ سفر جناب قطب الدین حسین انجینیر کی دعوت پر ہوا۔ خواجہ کلیم الدین صاحب، ان کے صاحبزادے بلال اور میں، ہم تین آدمیوں نے رات ان کے مکان پر گزاری۔ صبح کو ہم لوگ ٹرنٹن (Trenton) گئے۔ یہاں کی خوب صورت مسجد میں فجر کی نماز پڑھی گئی۔

فجر کی نماز کے بعد میں نے انگریزی میں درس دیا۔ اس کے بعد چائے سے فارغ ہو کر دوبارہ مسجد کے وسیع بیسمنٹ میں لمبی نشست ہوئی۔ اس میں عرب اور نومسلم امریکی بھی شریک

تھے، اس لیے یہاں بھی انگریزی میں تقریر کرنا پڑا۔ تقریر کے بعد دیر تک سوال و جواب کی صورت میں یہ مجلس جاری رہی۔ درس کا خلاصہ صفحہ کے نیچے درج ہے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ مرنے کے بعد آنکھ کا عطیہ دینا اسلام میں جائز ہے اور اس کے شرعی دلائل پیش کیے۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں ہے کہ آنکھ اور دوسرے اعضاء سے حشر میں سوال کیا جائے گا۔ پھر ان کا عطیہ ہم کیسے دے سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مردہ کو دفن کرنے کے کچھ دنوں بعد اگر آپ قبر کھود کر دیکھیں تو وہاں صرف ہڈیاں ہڈیاں پڑی ہوئی ہوں گی۔ اب سوال یہ ہے کہ آدمی کا سارا جسم (بشمول آنکھ) کہاں چلا گیا۔ وہ کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو گیا جو انھوں نے جبری عطیہ کے طور پر لے لیا۔

۲۴ اگست کی صبح کو دوبارہ ہم لوگ نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں جناب خواجہ کلیم الدین صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے پوچھا کہ ہمارے یہاں سے جو انگریزی کتابیں چھپی ہیں، ان کی زبان کے بارے میں یہاں کے اہل زبان لوگوں کا تاثر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس کی زبان کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں امریکہ میں لکھی گئی ہیں۔

ایک واقعہ پیش آیا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ یہاں جب تک آدمی غلطی نہ کرے یہ لوگ مداخلت نہیں کرتے۔

۲۴ اگست کی شام کو جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے دو نوجوانوں کے نام یہ تھے —— مسٹر مشتاق گوہر، مسٹر عامر صدیقی۔ دونوں ذہین ہیں اور اسی کے ساتھ اسلام پسند بھی۔ ان سے موجودہ مسلم دنیا کے حالات پر گفتگو ہوئی۔ دونوں ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ مشتاق گوہر صاحب نے کہا کہ آپ کی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ مجھے آپ کی باتوں سے اتفاق ہے۔ مگر یہ بتائیے کہ کیا یہ تحریک کی صورت میں بھی کہیں چل رہی ہے۔ میں نے کہا کہ تحریک تو ہر جگہ چل رہی ہے۔ اور آپ خود بھی اسی تحریک کی ایک مثال ہیں۔

ایک صاحب نے پہلے حبیب اور خلیل کے لغوی معنی پوچھا۔ پھر پوچھا کہ دونوں میں

زیادہ اہم کون ہے۔اس کے بعد خود ہی کہا کہ ابراہیم خلیل اللہ تھے،اور ہمارے پیغمبر حبیب اللہ تھے۔اور حبیب اللہ کا درجہ بلاشبہ خلیل اللہ سے بہت زیادہ ہے۔

امریکی کلچر میں بچوں کے اندر خود تعظیمی (self-esteem) کی صلاحیت پیدا کرنے کی بہت زیادہ کوشش کی جاتی ہے۔یہ بڑھتے بڑھتے وہاں تک جا پہنچی ہے جس کو بھرم کہا جاتا ہے۔ نیویارک ٹائمس میں اس رجحان کے خلاف ایک مضمون شائع ہوا تھا۔اس میں ایک قصہ بتایا گیا تھا کہ ریاضی کا ایک سوال ایک امریکی بچہ کو دے کر پوچھا گیا کہ کیا تم اس کو کروگے۔ اس نے فوراً کہا کہ ضرور (Oh, sure) پھر اسی سوال کو ایک جاپانی بچہ کو دے کر یہی سوال کیا گیا تو اس کا جواب یہ تھا کہ میں کوشش کروں گا (I will try) اس کے بعد جب دونوں سے کہا گیا کہ سوال کو حل کرو تو جاپانی بچہ نے تو ٹاپ کیا اور امریکی بچہ صرف ایوریج نمبر لاسکا۔

۲۵ اگست کو ظہر کی نماز فلشنگ کی مسجد میں پڑھی۔نماز کے بعد مسجد میں تقریر کا پروگرام تھا۔یہ مسجد تقریباً ۲۰ سال سے مسلمانوں کے پاس تھی۔اب اسی سال اس کو شاندار اسلامک سنٹر کی صورت میں تعمیر کرایا گیا ہے۔اندر اور باہر دونوں طرف سے نہایت خوب صورت ہے اور بالکل جدید طرز پر اس کو بنایا گیا ہے۔

۲۵ اگست کی شام کو ہم لوگ دوبارہ مسجد العابدین پہنچے۔یہاں کے امام شیخ ضمیر ستار (گیانا) نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں دوبارہ یہاں آؤں اور نماز مغرب کے بعد لوگوں کو ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں بتاؤں۔

میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے کہ: کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔

سلفی حضرات اپنے کو صحیح العقیدہ کہتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ وہ مطلوب عقیدہ پر قائم ہیں۔مگر میرا بار بار کا تجربہ ہے اور دوسروں نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ ان لوگوں کے اندر مطلوب عقیدہ والے اوصاف نہیں ہوتے۔قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب عقیدہ اگر کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے بعد لازمی طور پر اس کے اندر خشوع اور تواضع کی صفت پیدا ہونی چاہیے۔مگر ان لوگوں کے اندر برعکس طور پر قساوت اور کبر کا مزاج دکھائی دیتا ہے۔

خبر نامہ اسلامی مرکز - ۱۳۴

۱۔ اردو اکیڈمی کی طرف سے ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں ایک سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مولانا آزاد کی شخصیت پر تقریر کی۔ یہ تقریر انشاءاللہ الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲۔ سہارا میگزین (انگریزی) کے نمائندہ نے ۶ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس مسئلہ سے تھا کہ موجودہ سیاسی حالات کی نسبت سے مسلمانوں کا موقف کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔

۳۔ راشٹریہ سہارا میگزین کے نمائندہ مسٹر ایم جے انصاری نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر نئے سیاسی حالات میں مسلمانوں کے مستقبل سے تھا۔ اس سلسلہ میں ان کو اسلام کا نقطۂ نظر بتایا گیا۔

۴۔ آؤٹ لک کے نمائندہ رنجیت بھوشن نے ۱۵ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس بات سے تھا کہ ہندستان کے نئے سیاسی نقشہ میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ کوئی بھی سیاسی نقشہ صرف وقتی طور پر اور محدود طور پر ہی کام کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ مسلمانوں کے لئے کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تک ان میں مثبت طرز فکر پوری طرح نہ آسکا۔ میری نظر میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ خود مسلمانوں کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ کی غیر موجودگی ہے نہ کہ کسی خارجی خطرہ کی موجودگی۔

۵۔ آؤٹ لک ویکلی نیوز میگزین کے نمائندہ رنجیت بھوشن نے ۱۵ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر "ہندو فرقہ پرستی اور مسلمان" کے مسئلہ سے تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ قرآن کے مطابق مسلمان کے لئے خطرہ صرف ان کی کمزوری ہو سکتی ہے۔ باہر سے ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔

۶۔ انگریزی اخبار ٹیلی گراف (نئی دہلی) کی نمائندہ غزالہ وہاب نے ۱۶ اپریل ۱۹۹۸ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مذہب سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مذہب کو لوگ اس لئے نہیں چھوڑ پاتے کہ مذہب انسانی فطرت میں پیوست ہے۔ ہر آدمی خدا اور مذہب کا احساس لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ مادی محرکات لوگوں کو پوری طرح مذہب کو لینے میں مانع بن جاتے ہیں مگر اس کی فطرت اس سے انکار کرتی ہے کہ وہ مذہب کو پوری طرح چھوڑ دے۔

۷۔ کستوربا گرام اندور میں اپریل ۱۹۹۸ کے آخری ہفتہ میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع ۲۱ویں صدی کے لئے نئی قیادت کی تشکیل تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ۲۵-۲۶ اپریل کو دو تقریروں میں موضوع سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۸۔ اکھل بھارت رچناتمک سماج کی طرف سے ۲۸-۲۹ اپریل ۱۹۹۸ کو رشی کیش میں ایک کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع مذاہب کا اتحاد تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور زیر بحث موضوع پر اسلام کی روشنی میں ایک تقریر کی۔

۹۔ نئی دہلی کے فادر والسن تھمپو (Rev. Valson Thampu) مسلم۔ مسیحی تعلقات پر ایک جامع رپورٹ تیار کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دونوں فرقوں کے درمیان بہت سارے پہلوؤں سے مشابہت کے باوجود باہمی تعلقات بہت کم ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس دوری کو ختم کیا جائے۔ اور دونوں کے درمیان اختلاط کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔

۱۰۔ کشمیر ویلفیر سنٹر، ایک فلاحی اور رضاکار ادارہ ہے، جو کشمیر میں ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لئے تعمیری سوچ اور نیا مزاج پیدا کرنے کی نتیجہ خیز کاوشوں میں سرگرم عمل ہے۔ ہم وادی کے باشعور اور پر درد عوام کے تعاون کے متمنی ہیں۔

حمید اللہ حمید.... چیرمین

کشمیر ویلفیر سنٹر کمپ آفس بیروہ کشمیر ۱۹۳۴۱۱
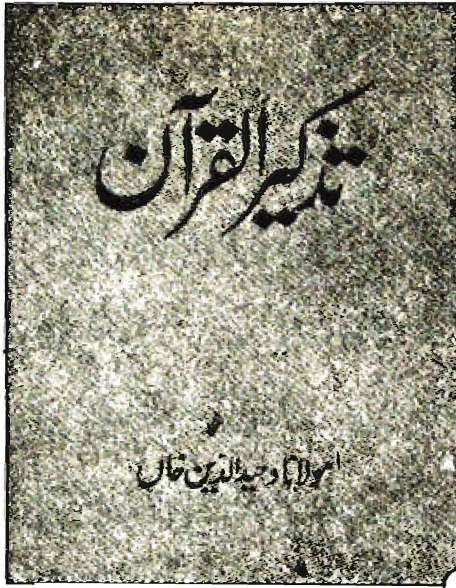
تذکیر القرآن

نئی طباعت
ایک جلد میں مکمل

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکزِ توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ : 400 روپے

1600 صفحات، باریک کاغذ پر ایک جلد میں مکمل۔

مساجد اور لائبریری وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لئے 5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر

نصف رعایت کے ساتھ صرف 200 روپے میں دستیاب ہے

5 کاپیاں یا اس سے زیادہ تعداد منگوانے پر ڈاک خرچ بھی ادارہ کے ذمہ ہوگا۔

اُردو

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن جلد اول	200/-
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	50/-
مذہب اور جدید چیلنج	55/-
عظمتِ قرآن	35/-
عظمتِ اسلام	50/-
عظمتِ صحابہ	7/-
دین کامل	60/-
الاسلام	45/-
ظہورِ اسلام	50/-
اسلامی زندگی	30/-
احیاءِ اسلام	35/-
رازِ حیات	65/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتونِ اسلام	60/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروانِ ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	40/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	35/-
راہِ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	70/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
عظمتِ مومن	7/-
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4/-
منزل کی طرف	2/-
فکرِ اسلامی	50/-
طلاق اسلام میں	3/-
دین انسانیت	60/-

کتاب	قیمت
شتمِ رسول کا مسئلہ	40/-
مطالعۂ سیرت	—
ڈائری جلد اول	80/-
کتابِ زندگی	65/-
انوارِ حکمت	—
اقوالِ حکمت	25/-
تعمیر کی طرف	8/-
تبلیغی تحریک	20/-
تجدیدِ دین	25/-
عقلیاتِ اسلام	35/-
مذہب اور سائنس	—
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	7/-
اسلام دینِ فطرت	7/-
تعمیرِ ملت	7/-
تاریخ کا سبق	7/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	12/-
ایمانی طاقت	7/-
اتحادِ ملت	7/-
سبق آموز واقعات	7/-
زلزلۂ قیامت	10/-
حقیقت کی تلاش	8/-
پیغمبرِ اسلامؐ	5/-
آخری سفر	7/-
اسلامی دعوت	7/-
خدا اور انسان	—
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	8/-
دینی تعلیم	7/-
امہات المومنین	20/-
تصویرِ ملت	85/-
دعوتِ اسلام	50/-
دعوتِ حق	40/-
نشری تقریریں	80/-

کتاب	قیمت
اسفارِ ہند	—
اسلام ایک تعارف	—
حیاتِ طیبہ	7/-
باغِ جنت	7/-
نارِ جہنم	7/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	7/-
مضامینِ اسلام	—
تعددِ ازواج	7/-
ہندستانی مسلمان	40/-
روشن مستقبل	7/-
صومِ رمضان	7/-
علمِ کلام	—
اسلام کا تعارف	4/-
علماء اور دورِ جدید	8/-
سیرتِ رسولؐ	—
ہندستان آزادی کے بعد	1/-
مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8/-
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8/-
الاسلام یتحدیٰ (عربی)	85/-
یکساں سول کوڈ	5/-
اسلام کیا ہے	8/-
ھندی	
سچائی کی تلاش	8/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
پیغمبرِ اسلامؐ	4/-
سچائی کی کھوج	—
آخری سفر	8/-
اسلام کا پریچے	8/-
پیغمبر اسلام کے مہان ساتھی	8/-
راستے بند نہیں	7/-
جنت کا باغ	8/-
بہو پتنی واد اور اسلام	7/-
اتہاس کا سبق	9/-
اسلام ایک سوابھاوک مذہب	8/-
اجول بھوش	8/-
پوتر جیون	8/-

Title	Price
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	85.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	295.00
An Islamic Treasury of Virtues	—
The Life of the Prophet Muhammad	75.00
Sayings of Muhammad	85.00
The Beautiful Commands of Allah	125.00
The Beautiful Promises of Allah	175.00
The Soul of the Qur'an	145.00
The Wonderful Universe of Allah	95.00
Presenting the Qur'an	165.00
The Muslim Prayer Companion	—
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	55.00
Religion and Science	45.00
The Way to Find God	20.00
The Teachings of Islam	25.00
The Good Life	35.00
The Garden of Paradise	35.00
The Fire of Hell	35.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
Uniform Civil Code	10.00

RNI 28822/76 • U(SE) 12/98
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/98

Al-Risāla